عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

# طلوعِ اسلام

اپریل 1939

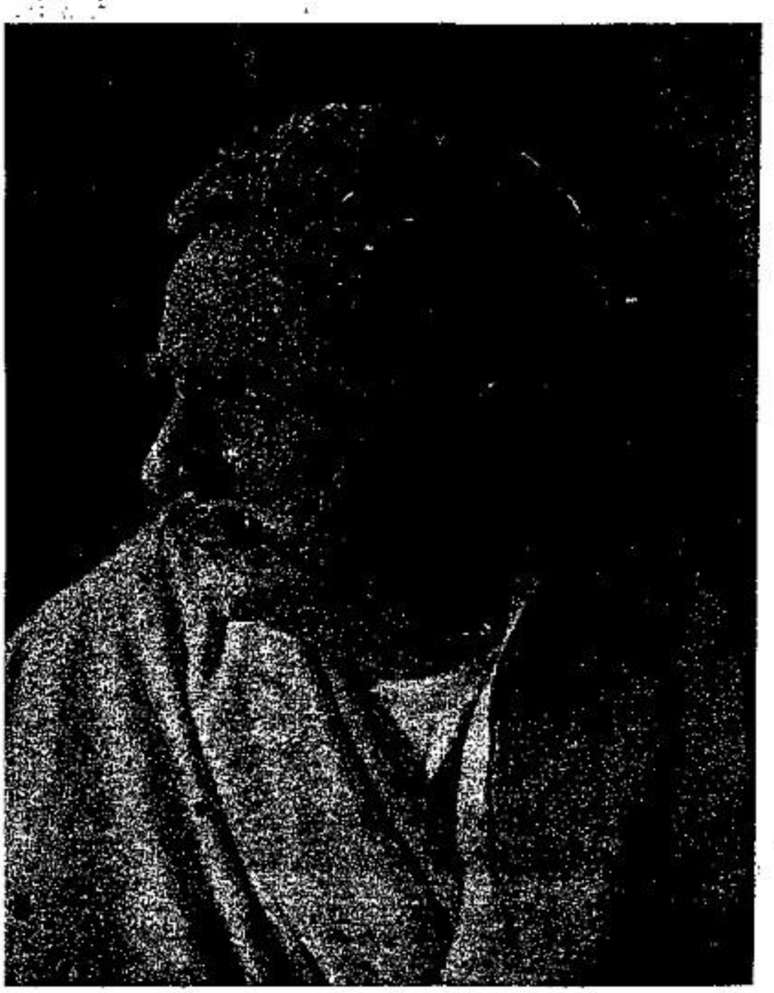

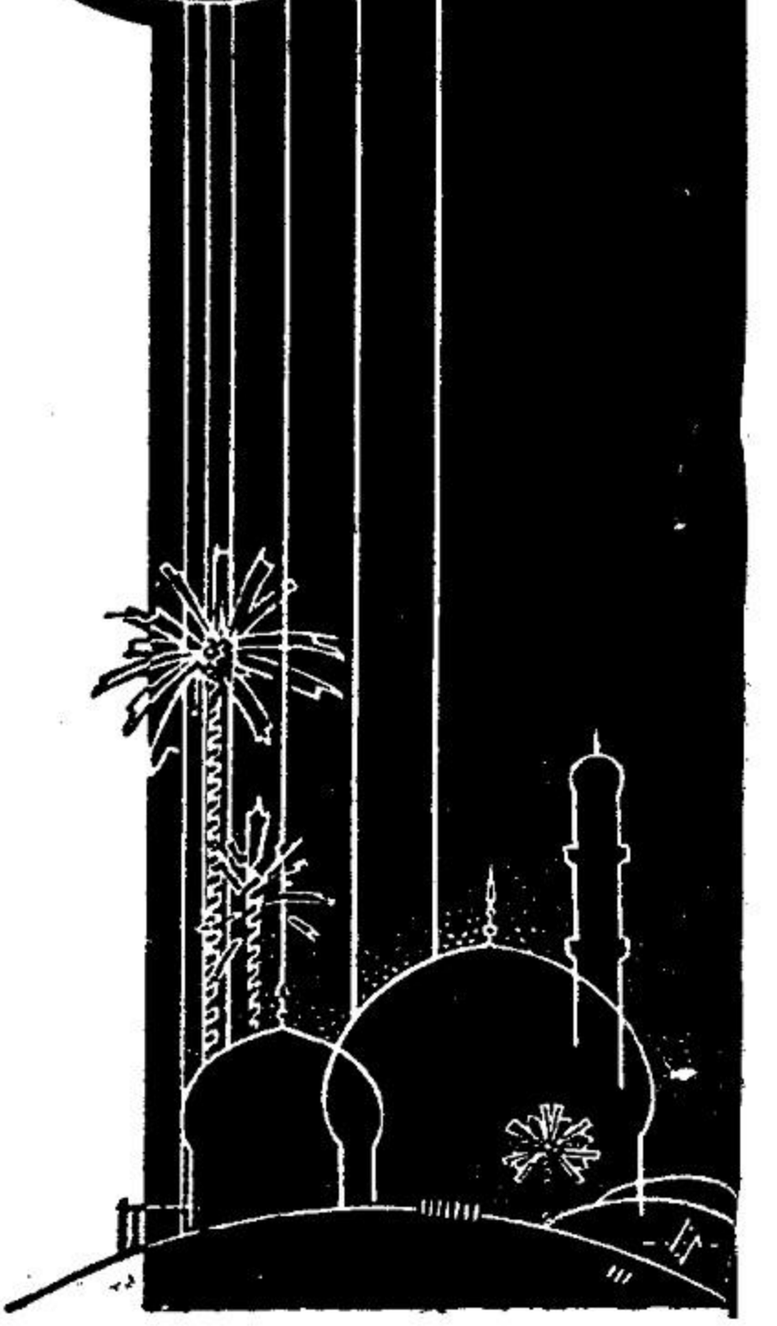

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

# مطبوعات دائرہ طلوع اسلام

الحمدللہ کہ دائرہ طلوع اسلام کی مطبوعات نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے ۔ واردہا اسکیم کے تین ایڈیشن نکل چکے گفتگوئے مصالحت دوبارہ طبع کرائی گئی اس طرح دیگر رسائل بھی ہاتھوں ہاتھ نکل رہے ہیں۔ ان مطبوعات کی خصوصیت یہ ہے کہ انکا نفع کسی فرد واحد کو نہیں پہونچتا۔ بلکہ اسکو طلوع اسلام کی ترقی اور دیگر تالیفات پر صرف کیا جاتا ہے ۔

## اسلامی معاشرت

مشہور متکلم اسلام مولانا غلام احمد صاحب پرویز نے اس رسالہ میں صحیح اسلامی معاشرتی زندگی کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو کس سانچہ میں ڈہالنا چاہتا ہے اگر آپ اپنی زندگی کا نصب العین معلوم کرکے اپنی سیرت کی تشکیل قرآن کریم کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں تو اسے ضرور ملاحظہ کیجیے۔ قیمت ۴ر محصولڈاک ۱ر

## واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

(از جناب رازی) اس کا چوتھا ایڈیشن بھی جو کئی ہزار کی تعداد میں چھپا تھا ختم ہو رہا ہے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اس کی مانگ جاری ہے ۔

قیمت مع محصول ۱۰ر

## سوراجی اسلام

(از جناب رازی) سیاسیات ہند میں تہلکہ ڈالنے والی کتاب جسنے کانگرسی لیڈروں کے عزائم کو بے نقاب کردیا ہے ، الہلال کے دور اول میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات کیا تھے ۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لیے کانگرسیوں کا متحدہ محاذ قیمت فی نسخہ ۲ر محصول ۱ر

## زبان کا مسئلہ

(از جناب رازی) ۔ اس رسالہ میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو کس طرح اردو کو تباہ کرکے ہندی اور سنسکرت کو ہندوستان کی قومی زبان بنا رہے ہیں۔ کانگرسی حکومتوں کے سرکاری ریکارڈ سے بتایا گیا ہے کہ ہندو وزیر اردو کو برباد کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کر رہے ہیں قیمت ۱ر علاوہ محصول

دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم


اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ


# طلوعِ اسلام

## دہلی


دورِ جدید

**مرتّب**

محمد ظہیر الدین صدیقی بی، ایس سی

**بدلِ اشتراک**

پانچ روپیہ سالانہ — فی پرچہ آٹھ آنہ

جلد (۲) — شمارہ ۱۲ — صفر المظفر ۱۳۵۸ھ مطابق اپریل ۱۹۳۹ء


## فہرستِ مضامین


| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ لمعات | ادارہ | ۳-۱۰ |
| ۲۔ علمِ تفسیر | جناب علّامہ اسلم صاحب جیراجپوری | ۱۱-۲۳ |
| ۳۔ نغمۂ اصنام | جناب اسد صاحب ملتانی | ۲۴ |
| ۴۔ پاکستان | جناب عبد الحمید صاحب پاک گجرانوالہ | ۲۵-۴۶ |
| ۵۔ مسجد کا مکمل تصوّر | جنابِ اسد صاحب ملتانی | ۴۷-۵۰ |
| ۶۔ پردہ | مولوی عزیز الحق صاحب بی اے بی ٹی نئی دہلی | ۵۱-۵۷ |
| ۷۔ دیوِ استبداد | ادارہ | ۵۸-۶۴ |
| ۸۔ حقائق و عبر | ادارہ | ۶۵-۷۷ |
| ۹۔ تقریظات | ادارہ | ۷۸-۸۰ |

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزِ ملت ← لا الٰہ الا اللہ ! محمد رسول اللہ → مرکزِ ملت

فلا و ربک لا یؤمنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت و یسلموا تسلیماً

# مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یا ایھا الذین اٰمنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعاً و لا تفرقوا — اللہ کی رسّی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو

استجیبوا للہ و للرسول اذا دعاکم لما یحییکم — بات مانو اللہ و رسول کی جب وہ تمہیں اس بات کیطرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

## یعنی

مرکز مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

## اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا

علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار

(فرمان رسول)

جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !

لا اسلام الا بالجماعۃ

(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت ایکہ گوئی لا الٰہ — با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

# لمعات

پچھلے سال اِن دنوں جس بیم و رجا کے عالم سے ہم گذر رہے تھے، آج جب اُس کا تصور آتا ہے تو دِل میں کچھ اِس قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے الفاظ شرمندۂ معنی نہیں کر سکتے۔ وقت کی نزاکت کا تقاضا اور ذمہ داری کا احساس پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ

پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

لیکن حالات کی نامساعدت۔ شبِ تاریک و موجِ بیم چھلاوا بن کر ڈراتی تھی کہ یہ وہ راستہ ہے جس میں

صد منزل است و منزلِ اوّل قیامت است

عزائم و مقاصد کا قصرِ بلند ایک طرف تھا۔ اور مشکلات و مصائب کا سیلِ بلا دوسری طرف۔ آرزوؤں اور تمناؤں کی نظر فریب وادی ایک طرف تھی اور ناکامیوں اور نامرادیوں کے ہولناک غار دوسری طرف۔ عزمِ بلند اور عدمِ اسباب کی اِس کشمکش میں ممکن ہے یاس و ناامیدی ہمتوں کو پست اور ارادوں کو فسخ کر دیتی اگر ایک دُور کی آواز یہ زندگی بخش پیام کان تک نہ پہنچاتی کہ

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیعَاد دار

چنانچہ اُس شاہنشاہِ گیتی نواز کی رحمتوں نے حوصلہ بندھایا۔ اور محض اُس کے فضل و کرم کے بھروسہ پر ۸ر اپریل ۱۹۳۸ء کو بِسمِ اللہِ مجرہا و مُرسٰہا کہکر طلوعِ اسلام کا پہلا پرچہ شائع کر دیا۔ جس کی پیشانی پر ہماری پوری داستان اِن الفاظ میں لکھی تھی کہ

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانِ دیگرے
ذرّۂ ناچیز و تعمیرِ بیاباں نگر!

قافلۂ شوق کی اِس بے سر و سامانی پر رہگذر کا ایک ایک ذرہ خندہ زن تھا۔ لیکن "دیوانہ" کو

کسی کی ہنسی کی کیا پرواہ ! وہ تو جوشِ جنوں میں خود ہر عقلمند کی خردِ بہانہ ساز پر ہنستا ہے اور اپنی دھن میں مستانہ وار بڑھے چلا جاتا ہے۔

---

پرچہ کے مقاصد کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ اس کا مسلک حضرتِ علامہ اقبال علیہ الرحمہ کے نورِ بصیرت کو عام کرنا۔ یعنی مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ سے متعلق ہر مسئلہ کا حل کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کرنا ہوگا۔ اس لئے حالات کی گوناگوں نامساعدت میں قوت و استقلال کا بڑا سہارا یہ تصور تھا کہ جس راہرو کو حضرتِ علامہ کی فراستِ قرآنی کی رہنمائی کی سعادت حاصل ہو جائے اسے دشوار گذار راستہ کے خطرات کا کیا ڈر ہو سکتا ہے۔ حضرتِ علامہ کی ذاتِ گرامی سے پرچہ کا انتخاب ! یہ تھی وہ دولت جس کے سامنے لعل و گہر کے ڈھیر بھی تودۂ خاک نظر آتے تھے۔ دعویٰ تھا تو برمحل اور فخر تھا تو برجا کہ

عجب کیا ہے مہ و پروین مرے نخچیر ہو جائیں
کہ با فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را

فخر و مسرت کے یہ جذبات ہمارے سینہ میں موجزن تھے۔ لیکن آسمان اسپر ہنستا تھا کہ مستقبل سے بے خبر انسان اپنے ذہن میں موہوم امیدوں کی کتنی حسین و جمیل دنیائیں آباد کرتا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہونے والا ہے۔ ۸ اپریل کو پرچہ شائع ہوا۔ اور ۲۱ اپریل کو یہ خبر سن لی کہ حضرت علامہ انتقال فرما گئے۔

جس کی سحر بھی شام ہو۔ اس کی شبِ سیہ نہ پوچھ

یہ وہ وقت تھا کہ دامنِ امید ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ قلبِ حزیں مُردہ آرزوؤں کا مزار بن کے رہ جاتا۔ ہمتیں ٹوٹ جاتیں۔ حوصلے پست ہو جاتے۔ اور زندگی میں کوئی سنہری کرن باقی نہ رہتی۔ لیکن یہاں پھر اس چارہ سازِ بیکساں کے ترحمِ خسروانہ نے دستگیری فرمائی اور اسی روح فرسا واقعہ کو آہنی عزم اور غیر متزلزل ارادوں کا باعث بنا دیا۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ جب طلوعِ اسلام حضرت علامہ کے نام سے منسوب کیا گیا ہے تو اب اسے ان کی سچی یادگار بن کر توفیقِ ایزدی زندہ رہنا چاہئے۔

ابتدا تو ہوئی ایسے ہمت شکن حالات کے ماتحت۔ لیکن مبدأ فیض کی کرم گستری نے جس طرح ایک ایک قدم پر حوصلہ افزا صورتیں پیدا کیں جب اُن پر نگاہ جاتی ہے تو جبینِ نیاز بے اختیار اُسکے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز ہوجاتی ہے۔ یقین مانیے کہ آج جبکہ ہماری مسافت کا ایکسال ختم ہو رہا ہے ہم پیچھے مڑکر دیکھتے ہیں تو باور نہیں کیا جاتا کہ یہ راستہ ہمیں نے قطع کیا ہے؟ ہرچند خریداروں کی تعداد کوئی خاص معیار نہیں لیکن اگر اور لوگوں کے زاویۂ نگاہ کی رعایت سے اِس ایک معیار کے مطابق بھی دیکھا جائے تو ایکسال میں جتنی مقبولیت طلوعِ اسلام کے حصہ میں آئی ہے، عام افسانوی اور رومانی رسائل کو چھوڑکر۔ اعلیٰ پایہ کے علمی رسائل دس دس پندرہ پندرہ برس میں بھی وہ جاذبیت پیدا نہیں کر سکے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ اور غالباً یہ بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ رسالہ خریداروں کی تعداد سے دُگنا اور سہ گنا چھپتا ہے اور اِس کا کوئی پرچہ دفتر میں باقی نہیں رہنے پاتا۔ یہ تو تھا رسالہ کے متعلق۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ مقبولیت اُن پمفلٹوں کو ہوئی جو وقتاً فوقتاً ادارہ کی طرف سے شائع ہوتے رہے۔ مثلاً

(۱) گفتگوئے مصالحت یا لیگ کا بنیادی مطالبہ } دو ایڈیشن

(۲) سوراجی اسلام
(۳) زبان کا مسئلہ
} دو ایڈیشن

(۴) وارودھا اسکیم —— چار ایڈیشن (قریب اٹھارہ ہزار)

(۵) متحدہ قومیت از مولانا حسین احمد پہلا ایڈیشن دو ہزار۔ قریب اختتام

(۶) عرضداشت بخدمت علمائے کرام
(۷) تہذیبِ مستقبل
(۸) خطبۂ صدارت علامہ اقبالؒ
} مارچ ۳۹ء میں شائع کئے گئے

(۹) اسلامی معاشرت
(۱۰) انفاق فی سبیل اللہ
(۱۱) پریم اور شانتی کا مذہب
} پہلا ایڈیشن۔ ختم ہوچکا

ان پمفلٹوں کی مقبولیت کا اس سے اندازہ فرمائیے کہ اکثر حضرات نے مختلف زبانوں، مثلاً پشتو۔ گجراتی۔ ملیالم وغیرہ میں ان کے تراجم شائع کئے ہیں۔ ملک کے بلند پایہ اخبارات و رسائل نے انھیں اپنے ہاں نقل کیا ہے۔ قومی اداروں۔ مذہبی درسگاہوں۔ مسجدوں۔ کالجوں اور مختلف انجمنوں میں ان کی عام اشاعت ہوئی ہے۔ ملک کے اعلیٰ سیاسی حلقے میں انھوں نے اتنا اثر پیدا کیا ہے کہ نگاہیں غیر محسوس طور پر مسائلِ حاضرہ کو انھی کی روشنی میں دیکھنے کی خوگر ہوگئی ہیں۔ رسالہ اور ان پمفلٹوں کی اس قدر عام اشاعت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ملک کی سیاسی فضا اسی رنگ میں رنگی گئی ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ وہ نظریات اور تصورات جو ایک سال اُدھر خاص خاص حلقوں میں محدود تھے وہ آج زندگی کے جیتے جاگتے مسائل بن کر عام لوگوں کی زبان پر ہیں۔ اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ اس قلیل سی مدت میں مسلمانوں کا زاویہ نگاہ بدل گیا ہے اور ان میں عام بیداری پیدا ہو رہی ہے۔

کہدیا جاسکتا ہے کہ طلوعِ اسلام نے زیادہ تر تخریبی پہلو نمایاں کیا ہے۔ تعمیری پہلو پیش نہیں کیا۔ ایک حد تک ہم بھی اس سے متفق ہیں۔ لیکن اربابِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں کہ

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

جب تک آپ غلط خیالات کو ذہن سے خارج نہیں کرینگے صحیح خیالات کبھی خاطر نشین نہ ہو سکینگے اور چونکہ غلط اور غیر اسلامی خیالات کی نشر و اشاعت ملک میں ایک منظم طریقے سے ہو رہی ہے اس لئے ان خیالات کے استیصال اور ان کے مہلک اثرات کے ازالہ کے لئے اس تخریبی طریق کار کی نہایت ضرورت تھی۔ اور ضرورت رہیگی۔ لیکن بایں ہمہ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ طلوعِ اسلام نے تعمیری پہلو کو نظر انداز کر دیا تھا۔ علاوہ مختلف موضوعات کے۔ اجتماعی زندگی۔ اسلامی نظام اور مرکزیت کے مضامین ایک خاص تعمیری پہلو کے حامل ہیں۔ پھر مارچ ۳۹ء کے پرچے سے آئندہ آئینی نظام کے متعلق جو طرح رکھی گئی ہے وہ ایک ایسی بنیاد ہے جس پر آگے چل کر ایک مستحکم عمارت قائم کیجائیگی۔ اور یوں بھی ابھی رسالہ کی عمر ہی کیا ہے۔ ایک سال کا عرصہ بھی کوئی عرصہ ہے !!

ہم نے آجتک اپنی تعریف و ستائش میں اپنی طرف سے کچھ لکھنا تو درکنار۔ اُن خیالات اور آراء کو بھی کبھی شائع نہیں کیا جو طلوعِ اسلام کے مضامین اور مسلک کے متعلق ہمیں موصول ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ کبھی اس بات کا بھی ذکر نہیں کیا کہ مُلک کے بہترین جرائد و رسائل نے اِس پر کیسے عمدہ ریویو لکھے ہیں۔ اِس لئے کہ ہمارے نزدیک طلوعِ اسلام خود اپنی سند آپ ہے۔ اور اس کے اصلی پرکھنے والے اس کے قارئین ہیں۔ رائے وہی صائب ہے جسے وہ از خود اختیار کریں۔ لیکن اِس پرچہ میں اپنی روش اور طبیعت کے خلاف جو کچھ ہم "اپنے متعلق" لکھ رہے ہیں وہ سب سے پہلے تو بطور تحدیثِ نعمت ہے کہ اُس ذاتِ بے ہمتا نے اپنے اِن ناچیز بندوں کی ان حقیر مساعی کو کس طرح اپنی رحمت و شفقت سے نوازا ہے۔ اور دوسرے اِس لئے کہ ہم اپنے آپ کو حلقۂ طلوعِ اسلام (جسمیں خریداران۔ ارکان اور دیگر معاونین حضرات سب شامل ہیں) کا امین سمجھتے ہیں۔ اور اِس لحاظ سے ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ انھیں بتایا جائے کہ ہم نے ان کی اس امانت کو اپنی ہمت و استعداد کے مطابق کس قدر دیانت کے ساتھ محفوظ و مصئون رکھا ہے۔ اور جو فرائض اُنھوں نے ہمارے ذمے لگائے تھے انھیں کس حد تک بحسن و خوبی سرانجام دے سکے ہیں۔

---

پھر اُس کی شانِ کریمی ہے کہ اُس نے اپنے آستانۂ قدس کے اِن بے نوا فقیروں کو جنھیں اُس نے "فقر" کے ساتھ "دماغِ سکندری" بھی عطا کر رکھا ہے، کسی دوسرے کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی ذلت سے ہمیشہ بچا کر رکھا ہے، اللہ کے مخلص بندوں کی اس جماعت نے جس کی حمیت اور خودداری کو دنیا کی کوئی قیمت بھی خرید نہیں سکتی۔ اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے دامن نہیں پھیلایا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اربابِ ہمم اُن کی اعانت کے لئے از خود آگے بڑھے۔ اور اُنھوں نے اس شرط کے ساتھ اشتراکِ عمل کیا کہ ان کا نام تک بھی ظاہر نہ کیا جائے۔ تاکہ اخلاص و للّٰہیت کے جوہر۔ نام کی شہرت اور ریا کی آگ سے نہ جل جائیں۔ اللہ اِن حضرات کو بہترین جزا عطا فرمائے۔ کہ حقیقی جزا۔ تو وہی ہے جو اُس کے ہاں سے ملے۔

---

ہم نے جہاں اپنی موافقت و تائید میں ملک کے گوشے گوشے سے آوازیں بلند ہوتی دیکھیں وہاں مخالفت کی آوازیں بھی ہمارے کان میں پڑیں لیکن یہ دیکھ کر ہمیں بے حد رنج اور صدمہ ہوا کہ مخالفت کسی اصول و مسلک یا دلائل و براہین کی بنیاد پر نہ تھی۔ بلکہ اس قسم کی سوقیانہ مخالفت تھی جو آجکل ہمارے سطحی اربابِ صحافت کا مایۂ ناز مشغلہ ہے۔ شکرِ باریتعالےٰ کہ اس نے ہمیں یہ توفیق بھی عطا فرمائی کہ ہم نے اپنے دامن کو اس قسم کی مخالفت کی جھاڑیوں میں الجھنے نہیں دیا۔ ورنہ ہم بھی اپنے مقصد پیش نظر سے کہیں دور جا پڑتے۔ اس مخالفت کے پروپیگنڈا میں ایک ایسی دلچسپ بات ہمارے سامنے آئی جس کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ یعنی بعض حضرات کو اور کچھ نہیں سوجھی تو انھوں نے یہ خیال پھیلانا شروع کر دیا کہ یہ تو "اہلِ قرآن" کی جماعت کا پرچہ ہے۔ حتیٰ کہ ایک بہت بڑے مولوی صاحب نے تو یہاں تک فرما دیا کہ متحدہ قومیت کے نظریہ کے متعلق طلوعِ اسلام نے جو مولانا حسین احمد صاحب پر تنقید کی ہے تو محض اسلئے کہ مولانا صاحب شیخ الحدیث ہیں اور طلوعِ اسلام اہلِ قرآن کا ادارہ ہے! یا للعجب!! انسان تعصب اور حسد میں کس حد تک آنکھیں بند کر لیتا ہے اور نہیں سوچتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے! فروری ۱۹۳۹ء کے پرچہ میں ایک اہلِ قرآن صاحب کے رسالہ صلوٰۃ المرسلین پر ایک مختصر سی تنقید مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری (ا-ج) کے قلم سے شائع ہوئی تھی۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ "اہلِ قرآن" حضرات کو ذاتِ رسالتمآب صلعم کی صحیح پوزیشن متعین کرنے میں کس قدر غلطی لگی ہے۔ اور جبتک وہ رسولؐ کی صحیح حیثیت سے واقف نہیں ہوتے قرآن کریم قیامت تک بھی ان کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس تنقید کے جواب میں مصنفِ رسالہ (یعنی انہی "اہلِ قرآن" صاحب) کا ایک طول طویل خط موصول ہوا ہے جس میں طلوعِ اسلام اور تنقید نگار دونوں کو ہدفِ سب و شتم بنایا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا — اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

اس سے آپ اندازہ فرمایئے کہ اس پروپیگنڈا کی کیا حقیقت ہے۔

---

ہمیں اپنی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کا بھی احساس ہے۔ جس کے لئے ہم بدل معذرت خواہ ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم سے کبھی کوئی ایسی لغزش نہ سرزد ہو جائے

جس سے ہمارا قدم صراطِ مستقیم سے بھٹک جائے۔ ہمیں اس بات کا بھی افسوس ہے کہ جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز کی مہتم بالشان کتاب "معارف القرآن" جسے ہم نے بالاقساط شائع کرنا شروع کیا تھا۔ التزاماً شائع نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر ماہ ایسے اہم مسائل سامنے آجاتے تھے کہ اُنکے متعلق کچھ نہ کچھ لکھنا نہایت ضروری ہوتا۔ اور یوں رسالہ میں گنجائش کم رہ جاتی۔ بہرحال پہلا سال ختم ہوگیا۔ آئندہ کے لئے ہمارے سامنے ایک واضح پروگرام ہے اور انشاء اللہ ہم اس کے مطابق چلنے کی کوشش کرینگے۔ جو کچھ ہم اس ایک سال میں کر سکے ہیں ہر چند وہ ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر تھا۔ لیکن ہمارے ارادوں اور آرزوؤں کے مقابلہ میں وہ ابھی پہلا قدم ہے۔ یہ وہ آرزوئیں اور تمنائیں ہیں جنھیں ہم عرق آلود پیشانی اور جھکی ہوئی آنکھوں سے ایک گدائے بے نوا کی طرح دامن پھیلائے اس شاہنشاہِ حقیقی کے قلبۂ عالیہ پر لے کر حاضر ہوتے ہیں جو ہر بیکس و ناتوان کا آخری سہارا ہے۔ اس التجا کے ساتھ کہ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝

---

جو حضرات شروع سے خریدار ہوتے ہیں۔ اپریل کے پرچہ کے ساتھ اُن کا چندہ ختم ہو جاتا ہے۔ اُن کے پرچوں میں یاد دہانی کا کارڈ الگ چسپاں ہے۔ اگر وہ حضرات رسالہ جاری رکھنا چاہتے ہیں تو براہِ کرم زرِ چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں۔ وی پی منگانے میں خرچ زائد پڑتا ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ پرچہ بند کر دینا چاہتے ہیں تو اس امر کی اطلاع دفتر کو دیدیں۔ ادارہ شکر گذار ہوگا۔

---

مہاتما گاندھی قضیۂ راجکوٹ کی آڑ میں تمام دنیا کی توجہات اپنی طرف مرکوز کر کے اب جناب وائسرائے سے ملاقات کے لئے دہلی براجمان ہیں۔ قرائن سے ظاہر ہے کہ فیڈریشن کے متعلق کچھ سودا

ہو رہا ہے۔ فیڈریشن جس شکل میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں موجود ہے اُس کی رو سے برٹش امپریلزم کے مفاد بھی محفوظ ہیں۔ اور ہندو اکثریت کی حکومت بھی یقینی ہے۔ اس لئے انگریز اور ہندو کا باہمی "شریف آدمیوں کا معاہدہ" مکمل ہو جانا کچھ بعید نہیں۔ مہاتما گاندھی کی ہستی آج انگریز اور ہندو کے لئے لاینفک ہے۔ اور مسلمان! چکی کے اِن دو پاٹوں میں گھرا ہوا ہے۔

نہ آسماں بگردش و ما درمیا نہ ایم
غالب دگر مپرس کہ برما چہ بگذرد

جہاں تک آئین و دستور کا تعلق ہے مسلم لیگ نے فیڈریشن کی ایک ایسی اسکیم مرتب کرنے کی تجویز کی ہے جو مسلمانوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔ ہمارے محترم ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب اس اسکیم کے مرتب کرنیوالے ہیں۔ اُن کی مرتب کردہ اسکیم اِسوقت ہمارے سامنے ہے۔ ہر چند اس کا ملخص اخبارات میں شائع ہو چکا[1] ہے لیکن ہم اس اسکیم کو سردست شائع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ ابھی لیگ کونسل کے اجلاس میں پیش ہوگی۔ اور غالباً اُس کے بعد کسی سب کمیٹی کے سپرد ہوگی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے جو مطالبہ پیش کیا گیا اگر وہ منظور نہ ہوا تو پھر! ظاہر ہے کہ اسوقت انگریز اور ہندو دونوں کا مقابلہ ہوگا۔ اور سخت مقابلہ۔ ہمیں معلوم ہے کہ آج ہم میں تشتت و افتراق ہے۔ یک نگہی و یک جہتی کا فقدان ہے۔ قوم میں قحط الرجال ہے۔ اور پھر غداروں کی بھی کمی نہیں۔ بایں ہمہ۔ جمہور مسلمانوں کی فطرت ہنوز صالح ہے۔ اور ان میں مسلمان کی زندگی جینے اور مسلمان کی موت مرنے کی تڑپ باقی ہے۔ ان کے سامنے اگر ذلت کی زندگی اور عزت کی موت کا سوال آ گیا تو یقیناً تمنائے موت سے اپنی حقیقی زندگی کا ثبوت دینگے۔ اور دُنیا کو بتا دینگے کہ

بے دست و پا نیم کہ ہنوز از وفورِ عشق
سوداست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

———— .... ———— واللہ المستعان

---

[1] یہ اسکیم اسٹیٹسمین مورخہ ۹؍۳۹ء میں شائع ہو گئی ہے۔ منہ

# علم تفسیر

از علامہ حافظ محمد اسلم جے راج پوری، جامعہ ملیہ دہلی

قرآن کریم ایسی صاف عربی زبان میں نازل ہوا جس کو عام طور اہل عرب سمجھتے تھے، خود قرآنی آیات میں قرآن کی زبان "عربی مبین" کہی گئی ہے یعنی بیّن اور واضح، اس لفظ کا استعمال قرآن میں جابجا اسی معنی میں ہوا ہے، مثلاً "فَاْتُوْا بِسُلْطَانٍ مُّبِیْنٍ" لاؤ ہمارے پاس کوئی کھلی ہوئی دلیل "اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ" شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے، یہی وجہ ہے کہ خود قرآن نے اپنی بھی صفت یہی بیان کی ہے، یعنے "اَلْکِتَابُ الْمُبِیْنُ" بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے کو نور مبین کہا ہے، نیز آیات قرآنی کو بھی "ایات بیّنات" کے نام سے موسوم کیا ہے "بَلْ هُوَ اٰیَاتٌ بَیِّنَاتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ" بلکہ وہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنکو علم دیا گیا ہے۔

الغرض قرآن کی زبان، قرآن کی تعلیم، اور قرآنی آیات کا مفہوم سب خود قرآن کے بیان کے مطابق واضح، کھلا ہوا بلکہ چمکتا ہوا نور ہے، یہی سبب ہے کہ اس نے بار بار تصریح کی ہے کہ "وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ" اور ہم نے قرآن کو نصیحت لینے کے لئے آسان کر دیا، کوئی ہے جو نصیحت لے نصیحت لینے کی آسانی کو دیکھنے کے لئے خود اہل عرب پر نظر ڈالنا کافی ہے، جو قرآن کے اولین مخاطب اور بالعموم بدوی اور ناخواندہ تھے جس کی وجہ سے قرآن نے اُن کو "اُمّیین" کا لقب دیا اور فرمایا "هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ" وہی اللہ جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول کھڑا کیا۔ اِن اُمیوں نے بے تکلف قرآن کو سمجھا اور اس کے اوپر عمل کیا۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

ان القران نزل بلغة العرب على اساليب بلاغتهم فكانوا كلهم يفهمون ويعلمون معانيه في مفرداته وتراكيبه[1]

قرآن عرب کی زبان میں ان کے اندازِ بلاغت کے مطابق نازل ہوا۔ ہر ایک اس کو سمجھتا تھا اور اس کے مفردات و مرکبات کے معانی کا علم رکھتا تھا۔

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۶۷۔

علّامہ موصوف کا مقصد غالباً یہ ہے کہ اہل عرب بالعموم قرآن سے اس کی تعلیمات کو سمجھتے تھے، ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر فردِ امتِ عربیہ کا اس کے جملہ الفاظ کے معانی اور اس کی تمام تراکیب کی تفصیلات کا عالم نہیں ہو سکتا تھا۔ خود حضرت عمر فاروق رضؓ کے متعلق روایت ہے کہ کسی نے ان سے "وفاکھۃً وابّاً" میں "ابّاً" کے معنے پوچھے، جواب دیا کہ ہم کو تکلف و تعمق سے ممانعت کی گئی ہے، ایک بار اُنہوں نے منبر پر یہ آیت پڑھی "اَوْ یَاْخُذَھُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ" اور حاضرین سے تخوف کے معنی دریافت کیے، بنی ہذیل کے ایک شخص نے کہا کہ اس کے معنے تنقص کے یعنی کم کرنے کے ہیں۔ اور سند میں یہ شعر پڑھا [1]

تَخَوَّفَ الرَّحْلُ مِنْھَا تَامِکًا قَرِدًا    کَمَا تَخَوَّفَ عُوْدَ النَّبْعَۃِ السَّفَنُ

علیٰ ہذا ایک بار جمعہ کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ میں اپنے بعد جو اُمور سب سے اہم چھوڑ جاؤں گا اُن میں مسئلہ کلالہ بھی ہے میں نے جس قدر بار بار اس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور کسی مسئلہ کو نہیں پوچھا۔ اور اس میں آپ نے جس قدر سختی میرے ساتھ روا رکھی اور کسی مسئلہ میں روا نہیں رکھی۔ یہاں تک کہ اپنی اُنگلی میرے سینہ پر رکھ کر فرمایا کہ اے عمر! کیا تیرے لئے اس امر میں آیت صیف کافی نہیں ہے جو سورۂ نسار کے آخر میں ہے [2]

یہ واقعات تو حضرت عمرؓ کے بیان کئے گئے ہیں، جن کے علمی اور عقلی رتبہ سے ہم سب واقف ہیں پھر دوسرے تمام صحابہ کے متعلق یہ کیوں کر دعوے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہر لفظ اور ہر ترکیب قرآنی کا علم رکھتے تھے ہاں ایک اجمالی مفہوم ضرور سمجھ لیتے تھے، مثلاً "وفاکھۃً وابّاً" میں ان کے لئے یہ سمجھ لینا کافی تھا کہ یہاں اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا ذکر ہے "ابّاً" بھی اُنہیں میں سے ایک ہے۔ ہر آیت کے تفصیلی معانی تک پہونچنے کی تکلیف لازمی نہیں خیال کرتے تھے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ کر لینا کہ وہ بالعموم آیاتِ قرآنی کے سرسری مفہوم پر قانع تھے صحیح نہیں ہو سکتا۔ ابو عبدالرحمٰن سُلمی سے روایت ہے کہ صحابہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں سیکھتے تھے تو جب تک انکی علمی اور عملی حقیقت کو جان نہیں لیتے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم میں سے جب کوئی سورۂ بقر اور آلِ عمران پڑھ لیتا تھا تو ہماری نگاہوں میں بڑا ہو جاتا تھا [3]

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں زیادہ تر آیات محکمات ہیں جو اُصولِ دین اور احکامِ شریعت سے تعلق رکھتی ہیں، یا انبیاء کرام اور اقوام سالفہ کے نتیجہ خیز اور عبرت انگیز قصص ہیں ان کا سمجھنا جمہور کے لئے آسان ہے

[1] کتاب الموافقات ص ۵۷-۵۸۔ [2] تفسیر ابن جریر، ج ۶ ص ۲۶۔ [3] مسند امام احمد۔

مگر اسی کے ساتھ آیات متشابہات اور حقائق غامضہ بھی ہیں جن کو صرف راسخون فی العلم ہی سمجھ سکتے ہیں اور صحابۂ کرام میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی بیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی نگاہوں میں اس کا عملی پہلو غالب تھا۔

یہاں اس بات کی تصریح کی ضرورت ہے کہ ظاہری اور عملی حیثیت کے علاوہ قرآن کریم کی نظری اور عقلی حیثیت بھی اہم ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب جو آسانی کے ساتھ صرف چند اجزا میں نمایاں اور صاف لکھی جاسکتی ہے۔ قیامت تک کے لئے امت اسلامیہ کا دستور العمل بنائی گئی ہے۔ اور ہر زمان اور ہر مکان میں ان کی ہدایت کا نصاب قرار دی گئی ہے، اگر یہ ایسے حقائق جاودانی پر مشتمل نہ ہوتی جن کو ابدالاباد تک انسانی نسلیں ختم نہ کرسکیں گی تو کیوں کر ان کا دائمی نصاب ہدایت بننے کی صلاحیت رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے صرف عملی نصیحت ہی لینے کی ہدایت نہیں کی گئی۔ بلکہ اس میں تفکر اور تدبر کی بھی تاکید فرمائی گئی ہے مثلاً:۔

| | |
|---|---|
| كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِه ﴿۲۹﴾۔ | مبارک کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں۔ |

دوسری جگہ ہے:۔

| | |
|---|---|
| اَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰى قُلُوبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ | کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں۔ |

ایک اور آیت ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۴۴﴾ | اور ہم نے تیری طرف قرآن اُتارا تاکہ لوگوں کے لئے جو اُتارا گیا ہے اس کو ان کے سامنے بیان کردے اور تاکہ لوگ اس میں تفکر کریں۔ |

الغرض اہل نظر کو قرآن نے اپنی آیات میں فکر و نظر کی دعوت دی ہے تاکہ وہ ان سے اپنی ہدایت لینے اور اپنی فلاح کا راستہ نکالتے رہیں۔ فطرت کی دیگر اشیاء کی طرح جن میں غور کرنے سے جدید اکتشافات

ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان کے دریافت کرنے سے انسانی قومیں نت نئے منافع اور فائدے حاصل کرتی رہتی ہیں۔ یہ کتاب بھی کبھی ختم ہو جانے اور تھک جانے والی نہیں ہے۔ بلکہ انسانی نسلوں کی قیامت تک رہنمائی کرتی رہے گی۔ اور ہر زمانہ اور ہر ماحول میں ان کے سامنے ہدایت کی راہیں کھولے گی۔ اس کا دعوے ہے

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۲۷/۸۱ وہ نہیں ہے مگر سارے عالموں کے لئے نصیحت

یعنے جملہ بنی نوع انسان کے لئے خواہ وہ کسی عالم، کسی ماحول، کسی زمان اور کسی مکان میں ہوں۔ سورۂ نحل میں ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۱۶/۸۹ اور ہم نے تجھ پر کتاب اُتاری جو ہر شے کی تشریح ہے،

دوسرے مقام پر "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" کی بجائے "تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ" اس کی صفت بیان کی گئی ہے۔ اس ہر شے کے تبیان اور تفصیل کے لفظ سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کتاب میں ایسے حقائق مستمرہ کی تشریح ہے جن سے ہمیشہ انسانی نسلیں ہدایت کی راہیں نکالتی رہیں گی۔

یہی وجہ تھی کہ عہدِ رسالت میں فقہاء صحابہ اس کی آیات میں تدبر کرتے تھے اور بعض امور کو جو ان کے سامنے فی الجملہ واضح نہیں ہوتے تھے خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے تھے لیکن بہت کم کیونکہ کثرتِ سوال کی آفتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔

علامہ سیوطی نے اپنی مفید کتاب الاتقان فی علوم القرآن کی آخری فصل میں ان تمام تفسیری روایتوں کو جمع کر دیا ہے جو صحابہ کے توسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی ہیں۔ وہ کُل کی کُل ان کی کتاب کے بیس صفحوں سے بھی کم ہیں اور تنقید صحیح کے بعد تو بہت ہی تھوڑی رہ جاتی ہیں۔

## مفسّرین صحابہ

جن صحابۂ کرام سے یہ تفسیر کی روایتیں آئی ہیں ان میں سے جو حضرات خصوصیت کے ساتھ ممتاز ہیں وہ خلفائے اربعہ، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان میں سے حضرات شیخین سے بوجہ ان کے تقدم عہد اور اُمور اُمت میں مشغولیت کے نہایت کم روایتیں ہیں۔ حضرت عثمان اگرچہ قرآن سے اس قدر شغف رکھتے تھے کہ رات کا بڑا حصہ کھڑے ہو کر اسکی تلاوت میں گزارا کرتے۔ بلکہ کبھی کبھی خضوع و خشوع میں جب محویت کا

عالم طاری ہو جاتا تو ایک ہی آیت کو بار بار گھنٹوں تک دُہراتے رہتے مگر تفسیر کی روایتیں ان سے بھی بہت کم مروی ہیں۔ زیادہ روایتیں حضرت علیؓ سے کی گئی ہیں جو شوق دلاتے رہتے تھے کہ لوگ قرآن سیکھیں اور سمجھیں اور اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے کہ تم کو کتاب اللہ کی بابت جو کچھ پوچھنا ہے میری زندگی ہی میں مجھ سے پوچھ لو۔ کیوں کہ میں علم رکھتا ہوں کہ کون سی آیت کہاں اُتری، کب اُتری، اور کس کی بابت اتری اور دربار نبوی میں میں سوال کی جرأت بھی زیادہ رکھتا تھا[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی زیادہ روایتیں آئی ہیں جو سابقین اوّلین میں سے تھے اور جن کا لقب بوجہ اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے اور آپ کی نعلین بھی اُٹھاتے تھے صاحب النعلین تھا۔ اُنہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی ستر سورتیں یاد کی تھیں اور اپنے تمام اندازِ عمل میں آپ کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت پیدا کرلی تھی۔ انکی وفات ۳۳ھ میں ہوئی۔

حضرت اُبی بن کعب خزرجی انصاری عہدِ رسالت میں کاتبِ وحی تھے۔ اور صحابہ میں سید القراء اور قرآن کے عالم مانے جاتے تھے۔ حضرت عثمان کے عہد میں انتقال فرمایا۔ اور اُنہوں نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

حضرت زید بن ثابت کاتب دربار رسالت نجباء انصار اور علماء قرآن میں سے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری رمضان میں قرآن کا جو دور فرمایا تھا اس میں شریک تھے جس کی وجہ سے عہد صدیقی میں جب قرآن ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا گیا۔ یہی اس کے جامع قرار پائے۔ حضرت عبداللہ بن عباس ان کی رکاب تھاما کرتے تھے اور کہتے تھے کہ علما کی تکریم اسی طرح کرنی چاہیئے۔ ۴۸ھ میں وفات پائی۔

مگر ان دونوں حضرات یعنی ابی بن کعب اور زید بن ثابت سے تفسیریں کم مروی ہیں سب سے زیادہ روایتیں حضرت عبداللہ بن عباس سے آئی ہیں جن کا لقب بوجہ قرآن دانی کے حبرِ اُمت اور ترجمان القرآن تھا۔ ان کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی تھی کہ اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَ عَلِّمْہُ التَّاوِیْل۔ اے اللہ اس کو دین کی فقاہت اور قرآن کی فہم عطا فرما۔

[1] مراۃ التفسیر ص ۹

یہ اگرچہ صغار صحابہ میں سے تھے۔ مگر حضرت عمر ان کی عقل اور فراست اور قرآن فہمی کی وجہ سے ان کو اپنی مجلس شوریٰ میں شریک رکھتے تھے اور مشکل امور میں رائے لیتے تھے۔ ان کا انتقال ۶۸ھ میں ہوا۔

ان حضرات کے علاوہ ابو موسیٰ اشعری، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر۔ جابر بن عبداللہ، ابوہریرہ، انس بن مالک اور ام المومنین حضرت عائشہ و بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی تفسیریں منقول ہوئی ہیں۔

اکثر صحابۂ کرام بہ نظر احتیاط انہیں معانی پر اکتفا کرتے تھے جو بعض الفاظ یا آیات قرآن کی تشریح کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مسموع ہوئے تھے خود قرآن کی تفسیر میں کچھ کہنے سے پرہیز کرتے تھے۔ چنانچہ ابن سیرین نے کہا ہے کہ میں نے عبیدہ سے ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے کہا کہ اللہ سے ڈرو اور سیدھے چلے چلو۔ لیکن بعض صحابہ ابن مسعود اور ابن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم قرآن میں تدبر اور تفکر کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک جو چیز ناجائز تھی وہ یہ تھی کہ بلا حقیقت کو پہونچے اور اچھی طرح سمجھے ہوئے آیات کی تفسیر کی جائے۔ یا بعض اہل مذاہب مثلاً خارجی، شیعہ، قدری مرجی وغیرہ جو اس وقت پیدا ہو چکے تھے ان کے عقائد کے مطابق تاویل کی جائے[1]

اس زمانہ میں تفسیر کے لئے عربی زبان، جاہلیت کے رسوم و عادات جن کو قرآن نے مٹایا ہو عہد رسالت کے واقعات جن کا تعلق قرآن سے ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، اعمال اور قضایا وغیرہ کا جاننا ضروری تھا، انہیں کی مدد سے آیات کی تشریح کرتے تھے۔

## اسرائیلیات

قرآن میں دینی تعلیم کے علاوہ ایسے تاریخی حقائق بھی مذکور ہوئے ہیں جن کا علم اصلاح نفوس بشری کے لئے ضروری ہے مثلاً عالم کی تکوین، آدمؑ کی پیدائش، اور انبیاء سابقین اور اقوام گزشتہ کے واقعات، اور انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جب کسی شے کا ذکر سنتی ہے تو اس کے متعلق مزید معرفت کی خواہش اس میں پیدا ہوتی ہے، اس لئے عہد صحابہ میں لوگ ان امور کو ان علماء اہل کتاب سے جو اسلام لا چکے تھے، دریافت کرتے تھے، خود حضرت ابن عباس حبر امت بھی ابن جریر طبری کے بیان کے مطابق کعب احبار کے پاس بیٹھتے اور ان کی

[1] فجر الاسلام ص ۲۳۵

روایتوں کو اخذ کرتے تھے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ کر دیا تھا کہ "اہل کتاب کے اقوال کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب" مگر چونکہ ان امور کا تعلق اعمال شریعت کے ساتھ نہ تھا۔ اس وجہ سے اُن کے لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا۔ اس طرح پر اہل کتاب کی روایتیں بھی تفسیر قرآن میں شامل ہوگئیں۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے:۔

بالعموم عرب نہ پہلے سے اہل کتاب تھے، نہ علم رکھتے تھے۔ ان کے اوپر بدویت غالب تھی جب اُن کو موجودات کے اسباب، ابتدائے تخلیق اور امم سابقہ کے حالات وغیرہ کے جاننے کا شوق ہوتا تو اُن اہل کتاب سے جو مسلمان ہو گئے تھے دریافت کرتے۔ یہ بھی زیادہ تر انہیں کی طرح بدوی تھے، اور ان امور کو اُسی قدر جانتے تھے جس قدر عوام اہل کتاب۔ انہیں کے بیانات لوگوں سے منقول ہو کر آیات کی تفسیروں میں داخل ہو گئے، اور بوجہ اس کے کہ ان کا تعلق احکام شرعیہ سے نہ تھا، تدوین کے وقت مفسّروں نے مسامحت سے کام لے کر ان کی تنقید کی طرف توجہ نہیں کی اور انہیں کو کتب تفاسیر میں درج کر دیا[1]

عہد رسالت میں اہل کتاب میں سے جو حضرات اسلام لائے تھے ان میں سب سے پہلے یہودی عالم جن کو قرآنِ کریم نے " أَوَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَةً أَنْ يَعْلَمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ" کہہ کر اہلِ علم میں شمار کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام ہیں جو ہجرت نبوی کے بعد ہی مدینہ میں اسلام لائے ان کا انتقال ۴۳ھ میں ہُوا۔ ان سے حضرت ابو ہریرہ اور انس بن مالک نے روایت کی ہے۔

دوسرے حضرت سلمان فارسی ہیں۔ یہ اصلاً مجوس بلکہ ایک آتش کدہ کے متولی کے عزیز فرزند تھے گھر سے نکل کر ملک شام میں گئے وہاں عیسائیت اختیار کر لی۔ ایک مدت تک نصیبین اور اُس کے بعد عموریہ میں رہے اور آسمانی کتابوں کا علم حاصل کیا۔ پھر عرب کی طرف آئے۔ وادی القریٰ میں بنی کلب نے غدّاری سے اُن کو غلام بنالیا۔ اور فروخت کر ڈالا۔ قسمت کی یاوری سے مدینہ پہونچے۔ وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے، حضرت عثمان کی خلافت میں مدائن میں

[1] مقدمہ ص ۳۶۷

وفات پائی[1]

جس طرح حضرت بلال کو حبشیوں نے اور حضرت صہیب کو رومیوں نے اپنا قومی افتخار اور نمونہ بنایا۔ اسی طرح اہل فارس نے اسلام لانے کے بعد حضرت سلمان فارسی کو اپنی قوم کا پیش رو قرار دیا، ان کے حالات میں غیر معمولی باتیں بڑھائیں۔ اور ان کی طرف بہت سی روایتیں منسوب کیں بالخصوص صوفیہ عجم نے جن میں سے اکثر اپنا سلسلۂ ارادت ان تک پہونچاتے ہیں۔

تیسرے صحابی جن سے اس قسم کی روایتیں آئی ہیں حضرت تمیم داری ہیں جو ۹ھ میں مدینہ میں آکر مسلمان ہوئے تھے۔ یہ نصاریٰ یمن میں سے تھے۔ اور قصہ گوئی کرتے تھے۔ یعنی گذشتہ انبیاؑ اور اقوام کے حالات سناتے تھے۔ حضرت عمر کی خلافت میں ان سے قصہ گوئی کی اجازت طلب کی۔ مگر اُنہوں نے منظور نہیں فرمایا۔ آخر میں ان کے بہت اصرار کی وجہ سے صرف اس قدر اجازت دی کہ جمعہ کے دن اس سے پہلے کہ میں جماعت کے لئے نکلوں تم قصے سُنا لیا کرو۔ حضرت عثمان کے عہد میں ان کو ہفتہ میں دو دن کی اجازت مل گئی[2] جساسہ اور دجّال کی روایتیں انہیں سے مروی ہیں۔

اس قصہ گوئی کی دو صورتیں ہوتی تھیں ایک قصص عامّہ کہ مسجد میں قصّاص مسلمانوں کے مجمع میں بیٹھ کر ان کو دوسری قوموں کے وہ حکایات اور حالات سُناتا جو اس نے اپنے بزرگوں سے سُنے تھے دوسری قصص خاصہ جو کسی بڑے آدمی کے سامنے بیان کئے جاتے تھے[3] عہد صحابہ ہی میں قصہ گوئی کا رواج عوام کی دل چسپی کی وجہ سے بہت بڑھ گیا اور چونکہ یہ قصے کذب آمیز بلکہ زیادہ تر بے بنیاد افسانے ہوتے تھے اس وجہ سے حضرت علی نے اپنے زمانہ میں قصہ گویوں کو مسجدوں میں بیٹھنے کی ممانعت کر دی، بجز حسن بصری کے کہ وہ سچائی کا خیال رکھتے تھے[4]

**تابعین** عہد صحابہ کے بعد روایت تفسیر میں مندرجہ ذیل حضرات نے زیادہ شہرت پائی:۔

عکرمہ مولےٰ ابن عباس جو ان کے مخصوص ترین شاگرد بھی تھے۔ یہ اپنے آقا یعنی عبداللہ بن عباس نیز حضرت عائشہ اور ابو ہریرہ وغیرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔

عطاء بن رباح۔ یہ حضرت عثمان، اسامہ بن زید، حضرت عائشہ، ام سلمہ، ابو ہریرہ اور بعض دیگر صحابہ

[1] طبقات ابن سعد ج ۴ ص ۵۳ [2] اصابہ ج ۱ ص ۸۴ [3] خطط مقریزی ج ۲ ص ۳۵۳ [4] فجر الاسلام ص ۱۸۸

رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ علماء مکہ میں فتوے کی ریاست انہیں پر منتہی تھی ۱۱۴ھ میں وفات پائی۔

ضحاک بن مزاحم خراسانی۔ یہ حضرت ابن عباس۔ ابن عمر۔ زید بن ارقم اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ ان کی تاریخ وفات ۱۰۵ھ ہے۔

سعید بن جبیر کوفی۔ یہ ابن عباس۔ عدی بن حاتم اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں ۹۵ھ میں حجاج بن یوسف کے حکم سے قتل کئے گئے۔

مجاہد بن جبیر یہ بھی حضرت ابن عباس کے شاگرد ہیں اور زیادہ تر انہیں سے روایت کرتے ہیں، ۱۰۳ھ میں مکہ میں عین سجدہ کی حالت میں وفات پائی

حسن بصری۔ یہ انس بن مالک، جندب بن عبداللہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں، ۱۱۰ھ میں انتقال فرمایا۔

ان کے علاوہ امام مسروق، زید بن اسلم، قتادہ، ابو العالیہ، ربیع بن انس اور عوفی وغیرہ اس طبقہ کے علماء تفسیر میں ممتاز ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کا قول ہے کہ تفسیر کا علم زیادہ علماء مکہ میں تھا، جو حضرت ابن عباس کے شاگرد تھے۔ مثلاً عکرمہ، مجاہد اور عطاء پھر اہل کوفہ میں جو حضرت ابن مسعود کے اصحاب تھے۔ جیسے حسن بصری اور مسروق وغیرہ۔

اس عہد میں اسرائیلیات میں بہت اضافہ ہوا۔ کیونکہ عوام کا رجحان انکی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ اس کو علمی تحقیق سمجھنے لگے تھے کہ قرآن میں جن انبیا اور اقوام کے قصص ہیں ان کے متعلق مزید حالات کا پتہ لگائیں۔ اس لئے جزئی سے جزئی اور چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی دریافت کرنے لگے۔ مثلاً سفینۂ نوح کی مقدار اور وسعت۔ اس میں جن جانداروں کے جوڑے لادے گئے تھے ان کے اقسام۔ حضرت ابراہیم کے قصہ میں چاروں پرندوں کے انواع۔ حضرت خضر کے ذکر میں غاصب بادشاہ کا خاندان اور اس بچہ کا نام ونسب جس کو خضر نے قتل کیا تھا۔ حضرت یوسف نے جن گیارہ ستاروں کو خواب میں دیکھا تھا، ان کے نشانات ومقامات، حضرت موسیٰ کے واقعہ میں ان کی بیوی کے متعلق تحقیق کہ وہ حضرت شعیب کی چھوٹی بیٹی تھیں یا بڑی۔ پھر یہ کہ انھوں نے آٹھ، یا دس سال کی دونوں مدتوں میں سے کونسی مدت پوری کی۔ اصحاب کہف

کے نام اور اُن کے کُتے کے رنگ و نسل غرض اسی قسم کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں امور کی بابت جن کو قرآن کریم نے لایعنی اور غیر ضروری ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا، بحث و تفتیش کرنے لگے یہی معلومات روایات کے ذریعہ سے پھیلیں۔ اور جب تفسیریں مدوّن ہوئیں تو ان میں درج کی گئیں۔ ان روایات کا سب سے بڑا مرجع دو شخص ہیں۔ ایک کعب بن ماتع جو یمن کے یہودی تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلام لائے اور مدینہ میں رہنے لگے۔ یہ کعب احبار کے نام سے مشہور ہیں۔ ان سے حضرت ابن عباس اور ابوہریرہؓ کے توسط سے زیادہ روایتیں آئی ہیں

دوسرے وہب بن منبہ۔ یہ بھی یمن کے یہودی مگر فارسی الاصل تھے، ان کی وفات صنعا میں سنہ ۱۱۰ھ میں ہوئی۔ اسرائیلیات میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ علماء ثقات مثلاً ابن قتیبہ یا امام نووی وغیرہ نے انکی کوئی روایت اپنی کتابوں میں درج نہیں کی۔ ابن جریر طبری نے اگرچہ ان سے قطعی پرہیز تو نہیں کیا ہے مگر بہت کم روایتیں لی ہیں لیکن ثعلبی وغیرہ نے انبیاء کے قصوں میں زیادہ تر انہیں کی مرویات درج کی ہیں[1]

یہاں اس حقیقت کا بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عرب کے ہر حصہ سے زیادہ یہودی ثقافت یمن میں شائع تھی، یہی وجہ ہوئی کہ وہاں کے اہل کتاب مسلمانوں سے اس قسم کی روایتیں زیادہ منقول ہوئیں۔

**اتباع تابعین** اس طبقہ میں بالعموم حاملین روایت کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ اُن میں سے جن کے نام تفسیر کے ساتھ مشہور ہوئے حسب ذیل ہیں:-

عطاء بن دینار متوفی سنہ ۱۲۶ھ، مقاتل بن سلیمان متوفی سنہ ۱۵۰ھ، سفیان ثوری متوفی سنہ ۱۶۱ھ، وکیع بن الجراح متوفی سنہ ۱۹۶ھ، سفیان بن عُیَینہ متوفی سنہ ۱۵۰ھ، نیز ابن جریج، اسحاق بن راہویہ، آدم بن ابی ایاس عبد الرزاق، اور امام مالک وغیرہ۔

اس طبقہ کے لوگوں نے تفسیر میں کتابیں بھی مدوّن کرنی شروع کیں۔ چنانچہ تاریخوں میں ان میں سے بعض تفاسیر کا ذکر ہے، مثلاً تفسیر ابن جریج، تفسیر سفیان بن عُیَینہ، تفسیر وکیع بن الجراح، تفسیر شعبہ تفسیر ابوبکر بن ابی شیبہ وغیرہ۔ مگر یہ سب کی سب فنا ہو گئیں اور ان میں سے کوئی بھی اُمّت کے ہاتھوں میں

[1] فجر الاسلام ص ۱۹۰ +

باقی نہیں رہی۔

ان کا طریقہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنے شیوخ سے جو روایتیں قرآن کی تفسیر میں سنتے ان کو قلمبند کر لیتے تھے۔ بڑا حصہ اسرائیلیات کا ہوتا تھا جس کی وجہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں۔ اس طبقہ میں ان روایات کے بطل کبیر ابن جریج ہیں جن کی نسبت بعض ائمہ جرح و تعدیل نے تصریح کی ہے کہ روایتیں وضع کرتے تھے[1] یہ ۸۰ھ میں اسلام لائے تھے اور ۱۵۰ھ میں انتقال کر گئے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ رومی الاصل تھے، اور امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ ابن جریج نے ۹۰ عورتوں سے متعہ کیا تھا[2] ابن خلکان کے بیان کے مطابق سب سے پہلی تفسیر اسلام میں اُنہوں نے ہی مدوّن کی۔ تبع تابعین کا سلسلہ دوسری صدی ہجری کے خاتمہ تک پہونچتا ہے۔ اس کے بعد ان کے شاگردوں کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد یعنے تیسری صدی ہجری میں تدوین کتب عام ہو گئیں۔ اسی میں صحاح ستہ لکھی گئیں جن میں تفسیر کی روایتیں کتاب التفسیر کے عنوان سے سورتوں کی ترتیب پر جمع کی گئی ہیں۔ ان کا بھی عام انداز وہی ہے جو ان کے اساتذہ کا تھا یعنی اُنہوں نے جستہ جستہ الفاظ و آیات قرآن کے متعلق متقدمین سے جو روایتیں سُنی ہیں۔ ان کو درج کر دیا ہے۔ یہ روایتیں بالعموم صحابہ کرام یا اُن کے تلامذہ کی ہیں خال خال ہیں۔ جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہیں۔ کتب صحاح ستہ کے تفسیروں کے یہ ابواب اس قدر مختصر ہیں کہ کسی سورہ کے ایک یا دو لفظوں اور کسی سورہ کی صرف ایک یا دو آیتوں کے متعلق روایات درج کی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ روایات قرآن کی تفسیر کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔ مگر خود ان سے ان کا کوئی گوشہ بھی سیراب نہیں ہوتا۔

**تنقید تفسیر** زیادہ تر اسی زمانہ یعنے تیسری صدی ہجری میں ائمہ جرح و تعدیل نے راویوں اور روایتوں کی تنقید کی۔ تفسیری روایات کا بڑا حصہ بوجہ ان کے رواۃ کے ضعف کے مشکوک ثابت ہوا، کیونکہ ضحاک بن مزاحم، مقاتل بن سلیمان، ابو صالح مصری، محمد بن سائب کلبی، السدی۔ محمد بن مروان، یشر بن عمار اور عوفی وغیرہ جن سے زیادہ تر یہ روایتیں آئی ہیں۔ جانچنے سے کمزور بلکہ بعض ان میں سے وضاع نکلے[3]

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ صحابہ کرام میں حضرت علی اور عبداللہ بن عباس کے نام سے تفسیر کی

[1] فجر الاسلام ص ۲۴۲ - [2] تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۱۵۳ - [3] مراۃ التفسیر، ص ۲۰ سے ۲۸ تک +

روایتیں زیادہ آئی ہیں اور یہی رواۃ کی کمزوری کی وجہ سے عام طور پر موضوع اور مجعول نکلیں جس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی کے شیعہ انہیں اقوال کو زیادہ احترام اور قبولیت کی نظر سے دیکھتے تھے جو ان کے نام کے ساتھ منسوب ہوں۔ اس لئے شیعہ رواۃ بیشتر انہیں کے نام سے روایتیں کرتے تھے، بلکہ جو بات ان کے ذہن میں ایسی آتی تھی جس سے حضرت علی کا علمی رتبہ ظاہر ہو اس کو بھی انہیں کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی جمرہ نے روایت کی ہے کہ حضرت علی نے فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو صرف فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹوں کا بوجھ تیار کر دوں[1]۔ وضع کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت علی کے نام سے جو روایات کی گئی ہیں ان کی کل تعداد ۵۸۶ ہے جن میں سے ائمہ حدیث کے نزدیک اُصول کی رو سے صرف پچاس صحیح ہے[2]

حضرت ابن عباس جن کی نسل سے خلفائے عباسیہ تھے مقربین بارگاہ کا مخصوص موضوع تھے۔ قرآن کریم کی کوئی آیت بلکہ کوئی لفظ خالی نہ ہوگا جس کی تفسیر میں ان سے روایت نہ کی گئی ہو، ان کی کل روایتوں کی تعداد ۱۶۶۰ ہے[3] جن میں سے امام شافعی کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ سو ایسی ہیں جو صحیح مانی گئی ہیں[4]

ابن عباس سے روایت کے جتنے طرق ہیں ان میں سب سے معتبر طریقہ "ابن صالح عن علی بن ابی طلحۃ عن ابن عباس" ہے۔ مگر جملہ حفاظ حدیث کا اجماع ہے کہ علی بن ابی طلحۃ کی لقا حضرت ابن عباس سے ثابت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ ان کے نام سے کہتے ہیں دراصل مجاہد اور سعید بن جبیر کی روایتیں ہوتی ہیں۔ دوسرا طریق جسکو محدثین نے شیخین یعنی امام بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق تسلیم کیا ہے "قیس عن عطاء بن السائب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس" ہے۔ مگر اس سلسلہ سے صرف چند ہی روایات ہیں باقی دوسرے تمام طرق مجروح ہیں۔ جویبر عن ضحاک سخت ضعیف سلسلہ ہے۔ ابن جریج نے جو کچھ روایت کیا ہے۔ اس میں صحت کا خیال ہی نہیں رکھا۔ کلبی کی روایتیں سب سے زیادہ کمزور ہوتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ جب مروان بن محمد بھی شامل ہو جائے تو یہ سلسلہ سرتاپا کذب ہو جاتا ہے[5]

[1] فجر الاسلام ص ۲۳۸۔ [2] الملل والنحل لابن حزم، ج ۴، ص ۱۳۷۔ [3] مراۃ التفسیر ص ۱۳۔
[4] اتقان ج ۲ ص ۱۹۵ + [5] اتقان، ج ۲ ص ۱۹۵ +

یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر بعض اکابر ائمہ نے تفسیری روایتوں کی صحت کا سرے سے انکار ہی کر دیا، چنانچہ امام احمد بن حنبل کا جو جرح و تعدیل کے امام اور بخاری و مسلم کے اُستاد ہیں قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں، مغازی، ملاحم اور تفسیر[1]

ہر چند کہ امام موصوف کے اس قول میں تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن ان کے تلامذہ نے کہا ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ بیشتر حصہ ان روایات کا ناقابل اعتماد ہے۔ غالباً اس تاویل سے ان کا منشا یہ ہے کہ ائمہ حدیث نے جن تفسیری روایتوں کو اصول حدیث کے مطابق صحیح قرار دیا ہے، وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جو روایتیں صحیح قرار دی گئی ہیں۔ ان میں بھی تنقید کی ضرورت ہے۔ مثلاً القناطیر المقنطرہ کی تفسیر میں امام حاکم نے حضرت انس سے روایت کی ہے کہ قنطار ایک ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے اور ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ بارہ ہزار اوقیہ کا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے صرف ایک ہی صحیح ہو سکتی ہے۔ مگر محدثین نے دونوں کو صحیح کہا ہے[2]

**مکمل تفسیریں** تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری میں پورے قرآن کی تفسیریں لکھی گئیں، مثلاً تفسیر ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، تفسیر ابن منذر متوفی ۳۱۸ھ، تفسیر ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ، تفسیر امام حاکم متوفی ۳۵۹ھ، تفسیر بن حیان متوفی ۳۶۹ھ وغیرہ۔

ان میں سے ہر ایک نے صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے علما سے روایات درج کی ہیں۔ خود اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی ہے بجز ابن جریر طبری کے جن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر آیت کو نقل کرنے کے بعد اس کے ایک ایک لفظ کے معانی لکھتے ہیں۔ متقدمین کے جو اختلافات ہوتے ہیں۔ ان کو اسناد کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ پھر خود ان میں سے ایک کو ترجیح دے کر اس کے وجوہ لکھ دیتے ہیں۔ الفاظ سے گزر کر آیات کے مفہوم کے متعلق بھی ان کا رویہ بعینہٖ یہی ہے۔ کہیں کہیں استنباط مسائل اور وجوہِ اعراب سے بھی بحث کرتے ہیں۔ الغرض ان کی تفسیر اسلام میں پہلی تفسیر ہے جس میں مولف نے اپنی دماغی کوشش اور ذہنی کاوش سے بھی کام لیا ہے، اور ہر موقع پر اس کی شخصیت نظر آتی ہے، دراصل انکی

[1] تذکرۃ الموضوعات للشیخ محمد طاہر ص ۸۲ [2] اتقان ج ۲ ص ۱۹۹

تفسیر اس کل قرآنی علوم کا مجموعہ ہے جو اس وقت تک علمار اسلام کے پاس تھا۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ امت کا اجماع ہے کہ ابن جریر طبری جیسی تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ امام ابو حامد اسفرائینی کا قول ہے کہ اگر کسی نے چین تک کا سفر کر کے بھی تفسیر طبری کو حاصل کر لیا تو کوئی بڑی زحمت نہیں اٹھائی[1] آج روئے زمین پر پورے قرآن کی سب سے پہلی تفسیر یہی ہے۔ یہ امّ التفاسیر بولی جاتی ہے۔ کیونکہ زمانہ مابعد میں جتنی تفسیریں لکھی گئیں سب کی سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ اس میں خرابی صرف یہ ہے کہ رطب و یابس ہر قسم کی روایات درج کر دی گئی ہیں۔ لیکن چونکہ سند ہر روایت کی اس کے ساتھ ہے اس وجہ سے جانچنا نہایت آسان ہے امام ابن تیمیہ کے شاگرد رشید حافظ ابن کثیر نے اسی کا خلاصہ اور تنقیح کر کے اپنی تفسیر مرتب کی ہے۔

## علمی تفسیریں

اب تک جس قدر تفسیریں لکھی گئی تھیں وہ خالص منقولی تھیں۔ یعنی روایات کا مجموعہ لیکن چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں مختلف قسم کی علمی تحریکات پیدا ہو گئی تھیں صرف و نحو، بلاغت و معانی، فقہ و اصول، منطق و فلسفہ، کلام و تصوف وغیرہ کا عام رواج ہو چکا تھا۔ ان علوم کے حاملین نے جو تفسیریں لکھیں ان میں بیشتر اپنے فنی زاویۂ نظر سے الفاظ و آیات کی تشریح میں بحثیں شروع کیں۔ اور روایات کے ساتھ ساتھ اجتہاد کا دروازہ بھی کھول دیا۔ علاوہ بریں نئے نئے مذہبی فرقے بھی پیدا ہو گئے تھے۔ ان اہل مذاہب نے اپنے عقائد و خیالات کے مطابق آیات کی تفسیریں کیں جن کی وجہ سے اختلافات کی بہت کثرت ہو گئی۔ اور تفسیروں کی نوعیتیں متعدد ہو گئیں۔ مثلاً زجاج اور کسائی وغیرہ نے جو صرف و نحو کے امام تھے اپنی تفسیروں میں خصوصیت کے ساتھ لفظی تصرفات اور وجوہ اعراب سے بحثیں کیں ثعلبی اور ابن اثیر نے جن کو تاریخ کا ذوق تھا قصص کی تفصیلوں کی طرف رجحان رکھا۔ فقیہ ابو اللیث سمرقندی اور علامہ قرطبی نے فروعات فقہیہ پر آیات سے استدلال میں توجہ صرف کی، ابو مسلم اصفہانی اور زمخشری نے معتزلی عقائد کے اثبات کی کوشش کی۔ اسفرائینی اور رازی نے اشعری اصول کے مطابق متکلمانہ بحثیں لکھیں۔ عبد القاہر جرجانی اور ابو ہلال عسکری نے بلاغت و معانی کے لطائف ظاہر کئے۔ محی الدین ابن عربی اور واحدی وغیرہ نے تصوف کا رنگ بھرا۔ اور شیعہ مفسروں نے آیات کو اپنے مذہبی خیالات کے مطابق بنانے سے سروکار رکھا۔ غرض اس وقت سے لے کر مفتی محمد عبدہٗ اور سر سید احمد خاں تک ہر زمانہ کی تفسیر اس

[1] مراۃ التفسیر ص ۳۸ +

اس زمانہ کی علمی بحثوں اور تحریکوں سے متاثر اور ہر فرقہ کی تفسیر اس کے عقائد و خیالات کا آئینہ نظر آتی ہے،

ان وجوہات سے اگرچہ تفسیروں میں وسعت تو بہت پیدا ہو گئی، لیکن بیجا تاویلات کا راستہ بھی کھل گیا اور اکثر فرقوں نے آیات قرآن کو اپنے خیالات کے مطابق اس طرح ڈھالنے کی کوششیں کیں جن کو معنوی تحریف کہنا بجا ہے۔ اس بے اعتدالی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تفسیر کے اصول نہیں متعین کئے گئے علماء اصول نے جو کچھ لکھا ہے وہ الفاظ کے استعمال کے متعلق چند عام قیاسی قاعدے ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ علامہ فناری نے تصریح کی ہے کہ علم تفسیر میں بجز چند امور کے اصول مطلقاً نہیں ہیں، جن پر اس کی جزئیات کا مدار ہو[1]

**شرائط تفسیر** متاخرین نے مفسر کے لئے کم سے کم پندرہ علوم جاننے کی شرط لگائی ہے، لغت، اشتقاق، صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع، قرأت، کلام (اصول دین)، اصول فقہ، اسباب نزول، قصص، ناسخ و منسوخ، فقہ اور حدیث[2]

لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ یہ تمام علوم مسلمانوں میں دوسری بلکہ تیسری صدی ہجری میں رائج ہوئے ہیں جس سے پہلے ہی قرآن کریم کو حضرات صحابہ و تابعین اور تبع تابعین صحیح اور بہتر طریقہ سے سمجھتے رہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان علوم مشروطہ کا ماخذ خود قرآن ہے۔ اسی سے علماء نے اس کو نکالا ہے۔ پھر یہ فہم قرآن کے لئے شرطیں کیوں کر قرار دئے جا سکتے ہیں، غالباً ان لوگوں کا مقصد جنہوں نے ان علوم کو شرط گردانا ہے یہ ہوگا کہ ان سے فہم قرآن میں مدد ملتی ہے، ورنہ ان میں سے اکثر تو قیاسی علوم ہیں جن میں غلطی کے پہلو بھی نکل آتے ہیں۔ چنانچہ وہ مفسرین جن کی تفسیروں کو علماء نے قابل اعتراض قرار دیا ہے نہ صرف یہ کہ ان علوم سے اچھی طرح واقف تھے، بلکہ اپنی تفسیروں میں ان کے اصول کو مرعی بھی رکھتے تھے۔

**کتب تفسیر** امام ابن جریر طبری کے بعد جس قدر تفسیریں لکھی گئیں ان کو کون شمار کر سکتا ہے صرف کشف الظنون میں جو ایک کتب خانہ کی فہرست ہے نو سو تفسیریں نام بنام مندرج ہیں، نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اپنی کتاب اکسیر میں اس سے بھی زیادہ تفسیریں گنائی ہیں۔ اگر دنیا کے تمام کتب خانوں کی فہرستیں دیکھ کر ان کی تعداد لکھی جائے تو آج بھی یقیناً کئی ہزار تک پہونچے گی۔ اس موقع

[1] مرآۃ التفسیر ص ۷، [2] اتقان، ج ۲ ص ۱۸۷

پر بہ ترتیب زمانہ چند مشہور تفسیروں کا نام لکھنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

چوتھی صدی ہجری میں تفسیر ابو الحسن اشعری امام اہل سنت متوفی ۳۲۰ھ تفسیر محمد بن علی اوفوی متوفی ۳۸۸ھ اس کا نام استغنا فی علوم القران ہے اور ایک سو بیس جلدوں میں ہے۔ تفسیر خلف بن احمد والی سیستان متوفی ۳۹۹ھ۔ یہ تفسیر سجستانی کے نام سے مشہور ہے اور سب سے بڑی تفسیر ہے۔

پانچویں صدی ہجری میں تفسیر ابن فورک متوفی ۴۰۶ھ تفسیر ابن ابو طالب مکی متوفی ۴۳۷ھ تفسیر امام ماوردی متوفی ۴۵۰ھ، تفسیر ابو مسلم اصفہانی متوفی ۴۵۹ھ تفسیر امام اسفرائینی متوفی ۴۷۱ھ تفسیر امام الحرمین استاد امام غزالی متوفی ۴۷۸ھ تفسیر راغب اصفہانی متوفی ۵۰۰ھ۔

چھٹی صدی ہجری میں تفسیر امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ جس کا نام یاقوت التاویل ہے اور چالیس جلدوں میں ہے۔ تفسیر امام بغوی محی السنۃ متوفی ۵۱۶ھ، تفسیر کشاف جار اللہ زمخشری متوفی ۵۲۸ھ، تفسیر امام ابن الجوزی بغدادی متوفی ۵۹۷ھ۔

ساتوی صدی ہجری میں تفسیر امام رازی متوفی ۶۰۶ھ، تفسیر شیخ محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ تفسیر سخاوی متوفی ۶۶۳ھ تفسیر بیضاوی متوفی ۶۸۲ھ۔

آٹھویں صدی ہجری میں تفسیر خازن شیخ علاء الدین علی بن محمد بغدادی متوفی ۷۲۵ھ تفسیر بحر المحیط ابو حیان اُندلسی،

نویں صدی ہجری میں تفسیر علامہ مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس متوفی ۸۱۷ھ تفسیر امام بلقینی متوفی ۸۲۴ھ۔

اس کے بعد جو تفسیریں لکھی گئیں وہ زیادہ تر انہیں تفسیروں کا خلاصہ یا التقاط ہیں، ان کے نام گنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ان چند تفسیروں کا ذکر ضروری ہے جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے امتیاز رکھتی ہیں۔ ان میں سب سے مقدم ابن جریر طبری کی تفسیر ہے جس کی مختصر کیفیت ہم لکھ چکے ہیں ہر زمانہ میں اہل علم اسی کو سب سے بہتر تفسیر تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ گویا تشریح قرآن کے لحاظ سے وہی پہلی تفسیر ہے اور وہی آخری تفسیر ہے۔ آج تک کوئی تفسیر اس کے رتبہ کی نہیں لکھی جا سکی۔

دوسری تفسیر جس نے علماء ادب میں شہرت حاصل کی ہے کشاف ہے۔ اس کے مؤلف علامہ زمخشری بلاغت و معانی کے امام تھے۔ اُنہوں نے اسی نوعیت سے یہ تفسیر لکھی لیکن زیادہ زور پہلے ہی پارہ کی تفسیر میں صرف کر دیا ہے، مگر اس میں اپنی فن دانی کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ بے نظیر ہے۔

تیسری تفسیر جو علماء معقول میں مقبول ہوئی، امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر ہے۔ اس میں طویل الذیل فلسفیانہ بحثیں ہیں۔ یہ اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں جب عالم اسلامی میں منطق ، فلسفہ اور علم کلام زیادہ رائج تھا۔ اس واسطے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی لیکن اہل منقول نے اسکو پسند نہ کیا کیونکہ علاوہ اسکے کہ اس میں بعض باتیں ان کے قدیم خیالات کے مطابق نہ تھیں۔ ان کو آیات کے ساتھ ان متکلمانہ مباحث کا جو ان کے تحت میں لکھے گئے ہیں۔ ربط نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ بعض بزرگوں نے کہہ دیا کہ "رازی کی تفسیر میں سب کچھ ہے بجز تفسیر کے"۔

امام رازی نے ربط آیات کی طرف بھی جابجا اشارات کئے ہیں۔ مگر ہر جگہ اس کا خیال نہیں رکھا ہے ان کے بعد علامہ شرف الدین ابو الفضل متوفی ۶۵۵ھ نے اپنی تفسیر میں جو بیس جلدوں میں ہے اور تفسیر مرسی کے نام سے مشہور ہے، ہر ہر آیت کے باہمی ربط اور اس کے وجوہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی۔ اسی عنوان پر شیخ علی مہائمی متوفی ۸۲۵ھ نے جن کا مزار بمبئی میں زیارت گاہ ہے، اپنی تفسیر تیسیر الرحمان لکھی۔ پھر شیخ ابراہیم بقاعی متوفی ۸۸۵ھ نے تفسیر بقاعی تالیف کی جو فی الجملہ اس سے بہتر سمجھی گئی۔ اس آخری زمانہ میں مولانا حمید الدین فراہی بھی ربط آیات کے عنوان سے تفسیر نظام القرآن عربی زبان میں لکھ رہے تھے، جو اُن کے انتقال کر جانے کی وجہ سے پوری نہ ہو سکی، صرف اس کے بعض اجزا شائع ہوئے ہیں۔

آیات کے علاوہ سورتوں کی ترتیب اور ان کے باہمی تناسب پر شیخ ابو حیان نے اپنی تفسیر البحر فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن لکھی ہے۔ شیخ ابو الفیض فیضی، اکبر آبادی متوفی ۱۰۰۴ھ کی تفسیر سواطع الالہام کسی معنوی خوبی کے لحاظ سے نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ غیر منقوط الفاظ میں لکھی گئی ہے۔

موجودہ دور میں شیخ جوہری طنطاوی کی تفسیر مغربی علوم کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ لیکن علمی لحاظ سے بہترین تفسیر شیخ محمد عبدہٗ کی ہے جس کی تکمیل ان کے شاگرد رشید علامہ سید رشید رضا مدیر رسالہ المنار مصر کر رہے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ ابھی نصف قرآن تک بھی نہیں پہونچے تھے کہ سید صاحب موصوف انتقال کر گئے۔ اور یہ مفید تفسیر ناتمام رہ گئی۔

نصاب درس کے لئے علماء اہل سنت کو صحت مفہوم اور اختصار دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے سب سے بہتر تفسیر جلالین ملی۔ جو نصف قرآن تک شیخ جلال الدین محلی متوفی ۸۶۴ھ اور بقیہ نصف شیخ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اسی قسم کی مختصر تفسیر مدارک بھی ہے جو علامہ نسفی کی تالیف ہے اور بعض مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ تفسیر بیضاوی کا ابتدائی حصہ سورۂ بقر تک بھی پرانے مدارس میں پڑھا دیا جاتا ہے۔ بیضاوی دراصل تین اہم علمی تفاسیر کا خلاصہ ہے۔ جہاں تک معانی و بیان کا تعلق ہے کشاف سے ماخوذ ہے متکلمانہ بحثیں تفسیر کبیر رازی سے اور حقائق و لطائف تفسیر راغب اصفہانی سے۔[1]

## علوم قرآن

جب سے مسلمانوں میں مختلف علوم کا رواج ہوا، اسی وقت سے اہل فن نے قرآن کی ایک ایک شعبہ پر جداگانہ بحثیں شروع کیں۔ اور ان کے متعلق کتابیں تصنیف کرنے لگے۔ مثلاً لغات القرآن۔ اعراب القرآن۔ بدائع القرآن قصص القرآن۔ احکام القرآن۔ اور حجج القرآن وغیرہ۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں ان علوم کو اسی انواع کا شمار کیا ہے۔ اور ان کے اوپر جو مشہور تصنیفیں ہیں۔ ان کو گنا ہے لیکن دراصل ان انواع کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے، اور ہر ایک بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر تصانیف کے انبار ہیں۔ مثلاً الفاظ القرآن۔ اس پر بہت سے علماء ادب ولغت نے مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ابو عبیدہٗ ابو عمرو زاہد اور ابن درید کی کتابیں مشہور ہیں۔ ان سب کا مجموعہ العزیزی کی کتاب ہے جس کو انہوں اپنے استاد ابو بکر ابن الانباری کی معیت میں پورے پندرہ سال کی محنت میں تیار کیا ہے۔ آخر میں راغب اصفہانی نے مفردات القرآن لکھی، جو الفاظ قرآن کے متعلق سب سے مفید ترکتاب تسلیم کی گئی ہے۔

اسی طرح اعجاز القرآن پر امام خطابی، رمانی، زملکانی فخر الدین رازی ابن سراقہ اور ابو بکر باقلانی کی کتابیں

[1] قضاء الارب ص ۲۳۸

ہیں۔ اس زمانہ میں مصر کے نامور ادیب مصطفٰے صادق رافعی نے اپنی کتاب آداب العربیہ کی دوسری جلد پوری اسی عنوان پر لکھی ہے جو سب سے بہتر۔ جامع اور دل کش تصنیف ہے۔ علی ہذا اقسام القرآن، امثال القرآن متشابہات القرآن، مبہمات القرآن، بلکہ آیات، الفاظ اور حروف قرآن کی تعداد وغیرہ تک کوئی عنوان ایسا نہیں ہے جس پر تصنیفیں نہ ہوں۔ یہانتک کہ خواص القرآن یعنے آیات سے تعویذات، عملیات اور نقوش وغیرہ پر بھی تیمی، امام غزالی اور رافعی وغیرہ نے کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔

قرآنی علوم پر یہ کتابیں مفسروں کے لئے نہایت کارآمد ذخیرہ ہیں۔ جن سے وہ اپنی تفسیروں میں مدد لیتے ہیں۔

## نقائص تفسیر

گذشتہ صفحات میں ان خرابیوں کی طرف جو تفسیروں میں واقع ہوئیں ضمناً اشارات کئے گئے ہیں۔ اب میں ان کے بڑے بڑے نقائص کو تفصیل وار بیان کر دیتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ ان مفسروں نے قرآن کی تشریح کے اصول مقرر نہیں کئے۔ علماً اصول نے جو قواعد لکھے ہیں۔ اول تو وہ مخصوص قرآن فہمی کو پیش نظر رکھ کر مرتب نہیں کئے گئے ہیں۔ بلکہ عام ہیں اور زیادہ تر ان کا تعلق الفاظ سے ہے دوسرے انکی بنا محض قیاس پر ہے جس میں ہر نقطہ پر اختلاف کی گنجائش اور غلطی کا احتمال ہے۔ تیسرے وہ صرف چند قاعدے ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ زمانہ مابعد میں امام ابن تیمیہ نے جو ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور تھے۔ اس ضرورت کو محسوس کر کے اصول لکھنے شروع کئے مگر نامعلوم وجوہ سے صرف تمہید ہی لکھ کر رہ گئے۔ آخری زمانہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے اصول تفسیر میں ایک رسالہ فوز الکبیر لکھا۔ لیکن اس میں بعض صرف ایسے مطالب کی مختصر تشریحات ہیں جن سے فہم قرآن میں مدد مل سکتی ہے ان کو اصول نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ محدود ضوابط نہیں ہیں جن سے کوئی مخصوص طریقہ تفسیر کا متعین ہو سکے۔ بلکہ وہ شاہ صاحب کے فہم قرآن کی نوعیت کو ظاہر کرتی ہیں اور بس۔

الغرض تفسیر قرآن کے اصول قطعاً مرتب نہیں ہو سکے ہیں۔ حالانکہ سب سے پہلا کام یہی تھا۔ اسلئے یہ تمام تفاسیر جو لکھی گئی ہیں کسی علمی یا عقلی اصول پر مبنی نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک ممتاز مفسر علامہ فناری کا قول نقل کر چکا ہوں کہ "تفسیر کے لئے بجز چند معمولی قاعدوں کے اصول مطلقاً نہیں ہیں جن پر اسکی جزئیات کا مدار ہو

(۲) ان مفسروں نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے۔ یعنی فاتحہ سے شروع کرکے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں، اور خاتمہ تک پہونچا دیتے ہیں۔ اس طرح آیات اور الفاظ کے معانی کی شرح تو ضرور ہو جاتی ہے۔ مگر قرآن سمجھ میں نہیں آتا۔ یعنے اس کی کوئی تعلیم حل نہیں ہوتی، اسلئے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ نہیں بیان کی گئی ہیں جس طرح انسانوں کی کتابوں میں بیان کی جاتی ہیں۔ بلکہ اسکی ہر تعلیم متعدد سورتوں اور آیتوں میں اسکے طول و عرض میں بتدریج اُتاری گئی ہے۔ تاوقتیکہ کسی خاص مسئلے کے متعلق تمام تعلیمات متفرق سورتوں سے نکال کر جمع نہ کرلی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے اس مسئلہ کی پوری قرآنی تعلیم ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتی۔ لہذا ان تفسیروں نیز ترجموں سے جو سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ چلتے ہیں۔ قرآنی تعلیمات کی توضیح نہیں ہوسکتی۔ فہم قرآن کے لئے ان تفسیروں کی نوعیت تقریباً وہی ہے جو فن طب میں کتب مفردات کی ہے جن میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ دواؤں کے نام، خواص آثار اور بدل وغیرہ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں ہوسکتا۔ بجنسہٖ اسی طرح ان تفاسیر و تراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی شخص حقائق قرآنی کا عالم نہیں ہوسکتا۔

(۳) اکثر تفاسیر میں آیات و الفاظ کی تشریحات روایات سے کی گئی ہیں اور تفسیری روایات کی بابت ہم لکھ چکے ہیں کہ ان کا بڑا حصہ خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل نے جن کے اوپر حدیث کی امامت منتہی ہوئی کہدیا ہے کہ تفسیری روایتیں تمامتر بے اصل ہیں قصص میں اسرائیلیات لائی جاتی ہیں جو بیشتر ناقابل اعتبار ہیں۔ یہی حال اسباب نزول کی روایتوں کا ہے قدیم مفسروں نے ان روایتوں کے سلسلۂ اسناد بھی لکھے تھے جن سے صحیح اور غیر صحیح کی تمیز بھی ہوسکتی تھی مگر متاخرین نے ان کو بھی حذف کردیا اور اپنی تفسیروں میں ان روایات کو بلا اسناد کے نقل کرنے لگے۔ جس کے باعث عوام میں ان کی حیثیت مسلمات کی سی ہوگئی۔ اور بہت سی آیتوں کی غلط تفسیریں

اُمت میں رائج ہوگئیں ۔ یہی سبب ہے کہ جس قدر تفاسیر کی کثرت ہوتی گئی اُسی قدر مسلمانوں کو قرآن کریم کی اصلی اور صحیح تعلیم سے بُعد ہوتا گیا ان غلط تفسیروں کی بہت سی مثالیں ہم نے ایک مقالہ میں جمع کی ہیں جسکو اُمید ہے جلد شائع کر سکیں گے ۔

(۴) ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے، الّا ماشاء اللہ زیادہ تر متقدمین ہی کی باتیں اور روایتیں نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ بعض بزرگ تو اس قسم کے گذرے ہیں جنہوں نے اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھکر لکھی ہیں یعنی تقرباً الی اللہ خدام قرآن میں داخل ہو گئے ۔ بجا لیکہ ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس پر کسی طالب قرآن کی زبان سے ان کے لئے مغفرت کی دعا نکلے یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں ۔ اس کی کوئی تلافی ہو سکے ۔ بیشتر اسی قسم کی تفسیریں تھیں جو معدوم یا متروک ہوگئیں ۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے جسکو قرآن نے سکھلایا ہے کہ "وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ" وہی چیز دنیا میں رہے گی جو لوگوں کے لئے نفع رساں ہوگی ۔

جن لوگوں نے دماغ سے کام لیا ہے ان میں سے اکثر ایسے جنہوں نے اپنے اپنے خاص خاص عقیدوں کو موقع بہ موقع قرآن کے ذریعہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اور بعض نے محض جدت طبع دکھائی ہے ۔ مثلاً ابن فورک نے حضرت ابراہیم کے قول لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ قلبی ان کے ایک دوست تھے یا "کطی السجل لِلْکُتُب کی تفسیر میں بعضوں نے کہا ہے کہ سجل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب کا نام تھا ۔ حالانکہ تمام ائمہ حدیث و تاریخ متفق ہیں کہ اس نام کا کوئی صحابی نہیں ہے ۔ یا "مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ" کی تفسیر علی و فاطمہ اور لولو و مرجان کی تفسیر حسنین رضی اللہ عنہم یا الصّابرین وَالصّادقین والقانتین وَالمنفقین والمستغفرین" کی تفسیر میں صابر سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ صادق سے صدیق ۔ قانت سے عمر فاروق منفقین سے عثمان غنی اور

مستغفرین سے حضرت علی رضی اللہ عنہم۔ غرض اسیطرح کی سینکڑوں آیات ہیں، جو ان حضرات نے مسخ کی ہیں[1] ایسی تفسیروں کے سوائے انسانی تخیلات کے آسمانی پیغام کی ماہیت نہیں سمجھی جا سکتی۔

(۵) یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ چنانچہ بہت سی محکم اور یقینی آیتوں پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں۔ بلکہ جن لوگوں نے ناسخ اور منسوخ پر کتابیں لکھی ہیں انکی تو کوشش یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں۔ ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی ایات منسوخ ہیں۔ ابو بکر ابن العربی نے ان کی تعداد کو کم کر کے صرف ۲۱ آیتوں کو منسوخ قرار دیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اور زیادہ غور کیا تو ان کے خیال میں صرف پانچ آیتیں منسوخ ثابت ہوئیں۔ مگر وہ بھی منسوخ نہیں ہیں۔ چنانچہ ہم نے تفصیل کے ساتھ ان کے اوپر اپنی کتاب تاریخ القرآن میں بحث کر دی ہے۔ غرض اس نسخ کے عقیدے نے بھی تفسیروں کے اندر ایک عجیب پیچیدگی پیدا کر دی ہے

(۶) یہ مفسرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے ہیں۔ مثلاً غیر المغضوب عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ کی تفسیر میں۔ اقوال ہیں وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ کی متعدد تفسیریں ہیں وشاهِدٍ وَّمَشْهُودٍ کی شرح میں کئی باتیں کہی گئی ہیں اَصْحَابُ الْاُخْدُوْد کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے۔ یا حبشی یا نجرانی یا شامی تھے۔ الغرض سینکڑوں الفاظ و آیات ہیں جن کی کئی کئی تفسیر یا۔ یا کر کے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو جزم و یقین کے ساتھ بیان نہیں کرتے۔ ان میں سے صحیح مفہوم کے فیصلے کی قوت خود ان کے اندر مفقود ہوتی ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کا مفہوم ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اس لئے ایسی تفسیروں سے بجائے اس کے کہ آیات کی توضیح ہو وہ اور مبہم ہو کے رہ جاتی ہیں۔

(۷) ان مفسروں کو قرآنی حقائق کی جستجو کم اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں کی تلاش زیادہ

[1] تذکرۃ الموضوعات ص ۸۴

رہتی ہے۔ جنت کا ذکر ہو تو اسکے پیالوں اور آبخوروں کی تعداد کا شمار اور کوثر اور طوبےٰ کی پیمائش کرینگے دوزخ کے بیان میں اسکے طبقوں کی گہرائی اور سانپوں اور بچھوؤں کی درازی ناپینگے جنگ بدر میں فرشتوں کے نزول کی حقیقت سمجھانے کی بجائے ان کے چہروں، گھوڑوں اور عماموں کے رنگ اور انکی سواری و حملہ و قتال کی کیفیت لکھیں گے۔ یاجوج و ماجوج کے تاریخی حالات بیان نہیں کرینگے بلکہ کوئی لکھیگا کہ انکے قد اس درخت سے مشابہ ہیں جو ملک شام میں نظر آتا ہے۔ اور جس کی بلندی ۱۲۰ گز ہوتی ہے اور کوئی لکھیگا کہ ان کا ایک کان اوڑھنا ہے اور دوسرا بچھونا، اگر ان چیزوں کا موقع نہیں پائینگے تو فصاحت و بلاغت کی لطافتیں دکھلانے لگیں گے یا خیالی فلسفیانہ بحثوں میں اُلجھ جائینگے۔

یہ سات بڑے بڑے عیوب و اسقام جو میں نے گنائے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ موجودہ تفسیروں میں سے شاید ہی کوئی تفسیر ان سے خالی ہو۔ انکے علاوہ اگر ان تفاسیر کی چھوٹی چھوٹی جزئی خرابیوں پر نظر ڈالی جائے تو وہ حد و شمار سے باہر ہیں۔

**خاتمہ**:۔ آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کو اگر نگاہِ بصیرت سے دیکھا جائے تو وہ خود اسقدر مفصل اور مکمل کتاب ہے کہ نہ صرف یہ کہ اپنے حقائق کی تفسیر اپنے اندر رکھتا ہے بلکہ اپنی مشکل الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح اپنی تعلیمات کی توضیح اور اپنے سمجھنے کے اصول اور قواعد پر بھی مشتمل ہے اور یہ اسکے کہ وہ عربی زبان میں ہے جسکا جاننا اسکے سمجھنے کیلئے ضروری ہے کسی دوسرے انسانی علم کا محتاج نہیں ہے۔

وہ نورِ مبین ہے جسکو دیکھنے کے لئے کسی چراغ اور کسی شمع کی حاجت نہیں اسکی تعلیمات کی تشریح اگر خود اسی کی تفصیلات سے کیجائے تو انسانی اوہام اور اباطیل کی وہ ظلمت جو اکثر کتب تفسیر میں نظر آتی ہے اسکی روشنی میں یکسر کافور ہو جائے۔ ہم اس یقین پر پہونچ چکے ہیں کہ الفاظ و آیات کے معانی میں جتنے اختلافات رونما ہو سکے ہیں انمیں فیصلہ کرنیکی پوری طاقت اور حقیقی مفہوم کو متعین کر دینے کی کامل صلاحیت ہمیں موجود ہے۔ اس حقیقت کی خود اس نے بار بار تصریح کی ہے۔ بلکہ یہ بھی وضاحت کے ساتھ بتا دیا ہے کہ کس قسم کے لوگوں کی سمجھ میں وہ آئیگا اور کون لوگ ہیں جو اسکی فہم سے محروم رکھے جائینگے۔ چونکہ ان مباحث کو میں اپنی کتاب تعلیمات قرآن میں مفصل اور مدلّل طور پر لکھ چکا ہوں۔ اس لئے یہاں ان کو دُہرانا غیر ضروری ہے ✣

# نغمۂ اصنام

(اسعد ملتانی)

دیکھ کر ضعف کے آثار مسلمانوں میں
بُت مسرت سے اُچھلتے ہیں صنم خانوں میں

اُن دلوں میں نہیں ایماں کی حرارت باقی
بجلیاں عشق کی بیتاب نہیں جانوں میں
بجھ گئی شمع جو اقبال کے اُٹھ جانے سے
سوز باقی نظر آتا نہیں پروانوں میں
کانپ اُٹھا کرتے تھے جس نعرۂ تکبیر سے دل
وہ صدا اب کبھی پڑتی ہی نہیں کانوں میں
غزنوی اب نظر آتا ہے کوئی اور نہ خلیل
نام ہی نام سُنے جاتے ہیں افسانوں میں
تھا اثر جس کا جہانبانی و عالمگیری
اب ہے وہ جذبہ ترکوں میں نہ افغانوں میں
کوہ و صحرا نے کئے تھے جو مجاہد پیدا
ہوئے آرام طلب آ کے گلستانوں میں
ہند کی آب و ہوا نے انہیں صحت بخشی
وہ جنوں اب نہیں اللہ کے دیوانوں میں
اُنکی غفلت میں بھی اعجاز مسیحائی ہے
اُنکے سو جانے سے جاں پڑ گئی بیجانوں میں

رقص یہاں رقص کہ اسوقت ہے میدان خالی
پھر کوئی شیر نہ آجائے نیستانوں میں"

# پاکستان قومی تحریک

آج جب کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر چاروں طرف سے ادبار کی گھٹائیں چھا رہی ہیں ان کی ملی زندگی کے تحفظ کے لئے ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ شمال مغرب میں جہاں وہ اکثریت میں ہیں انکی ایک مرکزیت قائم ہو جائے تاکہ وہ ہر مخالف طاقت سے بے نیاز اور بے خوف ہو کر اپنی قوم کی نئے سرے سے تعمیر کر سکیں۔ حضرت علامہ اقبال نے سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں شمال مغربی ہندوستان کی علیحدگی کی مبارک تجویز اپنے خطبۂ صدارت میں ملک و ملت کے سامنے پیش کی تھی۔ اور اسے وطن کی سیاسی اور معاشرتی مشکلات کا حل اور ہندو مسلم منافرت کا علاج بتایا تھا۔ وہ دیکھتے تھے کہ ہندوستان اسی وقت فراغت اور آزادی حاصل کر سکتا ہے جب کہ یہاں کی مختلف قوموں کو جداگانہ حقِ زیست عطا کیا جائے اور ان میں باہمی تعاون اور یک آہنگی پیدا کی جائے۔ کیونکہ مختلف اقوام کی انفرادیت مٹا دینے سے مقصد پورا نہیں ہوتا۔ یہ بھی ان کے مشاہدہ میں آیا تھا کہ جنگی سکون اور جملہ اقوام کے باہمی رابطہ اور موالنت کی جتنی کوششیں بھی راہنمایانِ قوم نے کی ہیں وہ سب نقش برآب ثابت ہوئی ہیں جس کا باعث یہ ہے کہ ہندو مسلم دونوں کی تہذیب، تمدن، ثقافت اور مذہب میں مشرق اور مغرب کا فرق ہے اور یہاں کی اکثریت دل میں کچھ اور ٹھانے بیٹھی ہے۔

ہمیں حیرت ہی نہیں بلکہ رنج ہوتا ہے کہ حضرت علامہ کے فکر و تدبر کا ہندوستان کے نام نہاد سیاسی حلقوں نے غلط اندازہ لگایا۔ اور اس مبارک تجویز کو شاعرانہ تخیل کہہ کر خارج از بحث کر دیا۔ وہ بات جو علامہ مرحوم نے برسوں کے غور و تجربہ اور اقوام عالم کے مدوجزر کے مطالعہ اور مذاہب عالم کے مقاصد اور مفہوم پہچاننے کے بعد کہی تھی اگر شاعرانہ تخیل کا نام پائے تو اس سے بڑھ کر بد ذوقی کم فہمی اور ناانصافی کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ ہماری قوم جوانانِ سعادت مند سے

خالی نہیں ہے۔ چنانچہ پیامِ اقبال کے ایک سچے علمبردار چودہری رحمت علی صاحب نے اس تجویز کی اہمیت کو سمجھا اور اسے عملی لباس پہنانے کے لئے اُنہوں نے ۱۹۳۲ء میں کیمبرج (انگلستان) میں اس مبارک تحریک کا سنگ بنیاد رکھا اور اسے "پاکستان قومی تحریک" کا نام دیا۔ یہ نام حضرت علامہ مرحوم کا تجویز کردہ نہیں ہے۔ یہ چودہری صاحب کی ایجاد ہے۔

پاکستان کا نام اس حصۂ ملک کے لئے وضع کیا گیا ہے جو پانچ شمال مغربی صوبہ جات پر مشتمل ہے اور لفظ پاکستان اُنہی صوبوں کے ناموں سے مرکب ہے۔ "پ" پنجاب۔ "ا" سے افغان صوبہ، (سرحدی صوبہ) "ک" کشمیر۔ "س" سندھ۔ اور "تان" بلوچستان سے ماخوذ ہے جس طرح ان پانچ صوبوں کے نام اپنی جُداگانہ خصوصیات کے ترجمان ہیں اسی طرح پاکستان بہ حیثیت مجموعی اس ملک کی جو اُنہی صوبہ جات کا مجموعہ ہے بدرجۂ اولیٰ نمایندگی کرتا ہے اور اس کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو کسی گروہ یا جماعت کے لئے موجب گرانی ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ نام ہر اس قابل فخر جذبہ کی رفعت کا باعث ہے جس پر ہمیشہ سے اقوام عالم کی زندگی اور وقار کا انحصار رہا ہے

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ موجودہ ہندوستان ایک واحد ملک کا نام نہیں۔ اس میں ایسے طبقات شامل ہیں جو تاریخی رو سے کبھی بھی ہندوستان خاص کا عنصر نہیں تھے۔ لسانی، نسلی، ثقافتی جغرافیائی اور تاریخی اختلافات اس قدر نمایاں ہیں کہ اہل ہند پر "ایک قوم" کا اطلاق کرنا حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے۔ رگ وید۔ مہابھارت اور مسلمانوں کے لٹریچر کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قدیم الایام سے لے کر انگریزوں کی آمد تک ہندوستان سے صرف وہ طبقہ ارضی مراد تھا جو پنجاب کے جنوب مشرق میں آباد ہے۔ یہ امر تسلیم کیا جاتا ہے کہ سکندر اعظم کے حملہ کا ذکر ہندوؤں کی لٹریچر کی کتابوں میں نہیں ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ پنجاب ہندوستان میں شامل نہیں تھا۔ لالہ لاجپت رائے کا قول ہے کہ سکندر ہندوستان کے کنارے سے ہی واپس چلا گیا تھا اصل ہندوستان میں داخل نہیں ہونے پایا تھا جس کے باعث ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر یونانیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ لفظ "ہندوستان" بھی بہت پُرانا نہیں ہے یہ نام اُسے ایران نے دیا ہے ورنہ بہت قدیم زمانہ میں اسے "بھارت ورش"

کہتے تھے ۔ یہ تو خیر تاریخی حقائق ہیں جغرافیائی حیثیت سے بھی شمال مغربی ممالک ہندوستان سے الگ ہیں ۔ ان کی آب و ہوا، پیداوار، زمین کی خاصیت ۔ دریاؤں کا بہاؤ ۔ ان کے باشندوں کے قدوقامت وضع قطع ، تراش خراش اور خوراک ولباس میں وہ ہندوستان خاص سے کوئی نسبت نہیں رکھتے ۔ بنابریں پانچ شمالی ممالک کو خواہ مخواہ "ہندوستان" کا جزو قرار دینا بے بصری کی دلیل ہے ۔

جغرافیائی حدبندیوں اور نسبتی امتیازات کو جانے دیجئے ۔ لیکن انسانی دلوں اور روحوں کے ہمالیہ پہاڑوں کو فراموش نہ کیجئے ۔ ہمارا مذہب ، ثقافت ، تاریخ ، روایات ، ادب ، اقتصادی نظام ، قوانین وراثت وغیرہ ہندوؤں سے بنیادی طور پر مختلف ہیں ۔ یہ نمایاں امتیازات محض بڑے اصولوں تک محدود نہیں بلکہ زندگی کی جزوی تفصیلات میں بھی ان کا اثر غالب ہے ۔ یہ بھی واضح رہے کہ لفظ "انڈیا" انگریزوں کی آمد سے قبل خلق نہیں ہوا تھا ۔ اور انڈیا کا موجودہ نقشہ انگریزوں کی سیاست کا پیدا کردہ ہے ۔ اگر بالفرض انگریز افغانستان یا ترکستان فتح کر لیتے تو وہ ان ملکوں کی پیشانی پر بھی جبراً انڈیا کا نام چسپاں کر دیتے ، موجودہ ہندوستان اتنی مختلف نسلوں کی آماج گاہ بنا ہوا ہے کہ اسے چھوٹے پیمانہ پر دنیا کا نقشہ کہا جائے تو غلطی سے بعید نہ ہوگا ۔ مذہبی اختلافات کے علاوہ یہاں نسلی تعصب بھی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے جس کی وجہ سے اتحاد اور موالنت کی صورتیں عنقا ہو رہی ہیں ۔ ان حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت علامہ نے فرمایا تھا ۔

> "ہندوستان ایک چھوٹا سا برعظم ہے جس کی سوسائٹی کے اجزا یورپ کی طرح ملکی نہیں ہیں ۔ یہاں مختلف گروہ آباد ہیں جو علیحدہ قوموں سے تعلق رکھتے ہیں اور علیحدہ زبانیں بولتے ہیں اور ان کا طرز معاشرت ایک متحدہ قومیت کے احساس کا مرہون منت نہیں ہے ..... اندریں حالات میری رائے ہے کہ پنجاب ، سرحد ، سندھ ، اور بلوچستان کو آپس میں ملا کر ایک جداگانہ سلطنت قائم کی جائے اور مسلمانوں کو ان کی روایات اور ثقافت کی فضا میں آزادانہ طور پر ترنگ و تاز کا حق دیا جائے ۔"

یہاں یہ اعتراض بے محل ہوگا کہ حضرت علامہ اسلام کو ایک محدود چار دیواری میں محبوس کر رہے

ہیں۔ اسلام کے لئے تو وہ کسی چار دیواری کے قائل ہی نہیں ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ تمام ملک میں ہماری قوتیں منتشر ہو رہی ہیں اور نظم و نسق اور اتحاد اور الحاق کا سلسلہ بالکل مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ان قوتوں کا ایک موزوں مرکز پر اجتماع ہو جائے۔ اسلام کے عالمگیر وجود کا علامہ سے زیادہ اور کون مداح اور ناشر ہوگا لیکن وہ مسلمانوں کی تعمیر اور استحکام کے لئے ایک علیحدہ اسلامی ریاست کے قیام کی اہمیت کو اپنے خطبۂ صدارت میں یوں نمایاں کرتے ہیں۔

"اسلام کی ثقافتی قوت کی بقا اسی میں ہے کہ ملک کے ایک حصہ میں اسکی مرکزیت قائم ہو جائے"

جب ہم نے یہ دیکھ لیا کہ پاکستان میں مسلمانوں کی مرکزیت قائم ہونی چاہیئے تو اب ہم پر یہ لازم آتا ہے کہ ہم تمام ملکی اور سیاسی آلودگیوں سے قطع نظر کر کے اپنی توجہ پاکستان پر مرکوز کریں۔ اور آنے والے وفاقی دستور حکومت Federation کے نفاذ سے پیشتر پاکستان کی علیحدگی اور جداگانہ ہستی کی حقیقت کو جغرافیائی تاریخی نسلی، مذہبی اور معاشرتی حیثیت سے اقوام عالم میں مشتہر کر دیں اور اپنے مستقل مطالبہ اور مسلسل کوششوں سے انگریزوں پر ثابت کر دیں کہ ہم ہندوستان کا جزو نہیں ہیں اور بالآخران سے منوالیں کہ پاکستان کو جداگانہ اور آزادانہ حق زیست ملنا چاہیئے اسی طریق کار کو چودھری رحمت علی صاحب جو فی الحال انگلستان میں تحصیل علم کے لئے مقیم ہیں بدرجہ اتم چلا رہے ہیں۔ یہاں یہ ذکر خالی از علت نہ ہوگا کہ حضرت علامہ نے اپنی تجویز میں کشمیر کی شمولیت کا ذکر نہیں کیا تھا اور انہوں نے اسلامی ریاست اور ہندوستان خاص میں سرہند کو حد فاصل تجویز کیا تھا لیکن پاکستان نیشنل تحریک کشمیر کو اپنے اندر شامل کرتی ہے اور اسلامی ریاست کی حد دریائے جمنا کو قرار دیتی ہے۔ دہلی ہمارا سیاسی اور ثقافتی مرکز رہا ہے اسے باہر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ان خیالات کی وسیع پیمانہ پر نشر و اشاعت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انگلستان اور آئرلینڈ کے اخبارات نے تحریک پاکستان پر خوصلہ افزا رائیں دی ہیں حتیٰ کہ جرمنی اور فرانسیسی اخبارات نے بھی اس میں بڑی دلچسپی لی ہے۔ ہم ذیل میں اخبار "آئرش انڈی پنڈنٹ" Irish Independent مورخہ ۲۱ اکتوبر ۳۵ء

کے تبصرہ کا اقتباس درج کرتے ہیں۔

"چودہری رحمت علی جو پاکستان نیشنل تحریک کے صدر اور بانی ہیں ایک خوشگوار اور دل کش شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ طبعاً ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ وہ انگریزی نہایت روانی اور بے تکلفی سے بولتے ہیں مگر ان کی فطرتی مناسبت زبردست جذبۂ وطنیت کی وجہ سے اپنی مادری زبان اُردو سے ہے جس کے ساتھ اُنہیں ایسی والہانہ دل بستگی ہے جو ہم میں سے اکثر لوگوں کو اپنی مادری زبان "آئرش" سے نہیں ہے۔ وہ بے پناہ جذبۂ حب وطن کے ایک زبردست مبلغ ہیں جس کی بنیاد مذہب پر ہے ..... ان کے پاس اپنے دعوے کی تائید میں نہایت معقول دلائل ہیں اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ شمال مغربی سرحد اور اس کے قریبی چار صوبوں یعنے پنجاب، کشمیر، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ملک بنا دیا جائے، جو پاکستان کے نام سے موسوم ہو ..... پاکستان میں غیر مسلموں سے کوئی ناانصافی نہیں ہوگی اور نہ اس تنگ نظری کو روا رکھا جائے گا جس کی بدولت ہندوؤں نے چھ کروڑ اچھوت پیدا کر دئے ہیں ..... چودہری صاحب کا لائحہ عمل بالکل آئینی ہے اور وہ یہ تصور نہیں کر سکتے کہ پاکستان کی علیحدگی اور آزادی کے خلاف کیا اور کیونکر اعتراضات ہو سکتے ہیں۔"

مقام مسرت ہے کہ انگلستان کے لوگوں کو بھی احساس ہونے لگا ہے کہ برطانوی حکومت نے اپنے مفاد کے لئے موجودہ حیثیت سے نقشہ بنانے میں زبردست غلطی اور ناعاقبت اندیشی کا ارتکاب کیا ہے۔ وہ ہندو مسلم نفاق اور منافرت کا ذمہ دار موجودہ دستور حکومت کو قرار دیتے ہیں اور اس بات کی اہمیت کو جاننے لگ گئے ہیں کہ اس کش مکش اور چپقلش کا علاج سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ دونوں قوموں کو علیحدہ علیحدہ خطوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ دونوں حسد اور بغض سے خلاصی پا کر امن و آشتی کی زندگی بسر کریں۔ چنانچہ لندن کے مشہور ہفتہ وار جریدہ "گریٹ برٹن اینڈ دی ایسٹ" ـــــ Great Britain and the East کی اشاعت مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۳۶ء میں ایک مضمون

"ہندو مسلم مناقشات" کے عنوان سے چھپا تھا جس کے جستہ جستہ الفاظ یہ ہیں ۔

"یہ کہنا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی مؤثر مفاہمت کی صورت پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہونے کا احتمال ہی ہو سکتا ہے ایک نہایت مبنی برحقائق بیان ہے ۔ اس الم ناک حقیقت کی ذمہ داری ہم انگریزوں پر عائد ہوتی ہے جو حقیقی مسئلہ سے احمقانہ طور پر پہلوتہی کر رہے ہیں ۔ ہم نے کسی ایک موقعہ پر بھی ہندو مسلم مسئلہ کو مستقل اور دائمی طور پر حل کرنے کی کوشش نہیں کی ..... ان تنازعات کا اصلی سبب وہ بنیادی اختلافات ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہیں مثلاً مذہبی روحانی ثقافتی وغیرہ اور ان کا صرف ایک ہی حل ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر قوم کے لئے ہندوستان میں ایک ملّی وطن مخصوص کر دیا جائے ..... انڈیا میں مسلمانوں کے مقابلہ پر ہندوؤں کو غالب اکثریت حاصل ہے اور اسی لئے وفاقی دستور حکومت (جس میں شمال مغربی ہندوستان کے وہ پانچ صوبہ جات پنجاب، سرحد، کشمیر، سندھ اور بلوچستان بھی شامل ہونگے) غالب طور پر ہندوانہ ہوگا ۔ یہ بالکل سچ ہے کہ یہ فرقہ وارانہ ہنگامے اس وقت تک ناگزیر ہیں جب تک کہ ہم اپنی اس ذمہ واری کو محسوس کرتے ہوئے جو ان قوموں کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہے پاکستان وطنی تحریک کے جائز مطالبہ کو تسلیم نہ کریں ۔ اس کے علاوہ اور کوئی حل ممکن ہی نہیں اس لئے جتنا جلد اسے قبول کر لیا جائے اتنا ہی ہندوؤں مسلمانوں اور انگریزوں کے لئے مفید ہوگا ۔"

یہ اقتباسات ہمارے اس خیال کی بہترین انداز میں تائید کرتے ہیں کہ پاکستان کا مطالبہ جائز ہی نہیں بلکہ ہندوؤں مسلمانوں اور انگریزوں تینوں کے لئے فائدہ مند بھی ہے ۔ اہل ہنود یا کسی دیگر غیر مسلم جماعت کو پاکستان کی علیحدگی کو اپنے حق میں نقصان کا باعث نہیں سمجھنا چاہیئے ۔ اسلام ایسا مذہب ہے جس نے تمام دنیا کو پیغام امن و صلح دیا ہے ۔ مسلمانوں کی دنیا کے جس حصہ میں بھی حکومت رہی ہے اُنہوں نے ہمیشہ انصاف اور رواداری کو محکوم اقوام کے لئے برقرار رکھا ہے ۔

اگر برادران وطن حقائق کو واضح طور پر دیکھ سکیں اور اپنے اندر تھوڑی سی کشادہ ظرفی پیدا کرلیں تو انہیں یقیناً پاکستان تحریک کا تجویز کردہ حل قبول کرنے میں دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ جہاں تک برسوں کے مناقشات کا تعلق ہے اس کا ایک ہی قطعی اور آبرومندانہ فیصلہ ممکن ہے اور وہ پاکستان کی علیحدگی ہے۔ افراد اور قوموں میں وہی مصالحت دیرپا ہو سکتی ہے جو ایک دوسرے کے حقوق کا مناسب تحفظ کرے، چونکہ پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں مسلمانوں کے پاکستان میں، اور ہندوؤں کے ہندوستان میں "قومی انا" کی محافظت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے مدتوں کی شکر رنجیاں اور دل آزاریاں مواسات اور دوستانہ تعلقات کی استواری میں تبدیل ہو جائیں گی۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ میں What Hindu India thinks کے عنوان سے ایک ماہر اقتصادیات ہندو پروفیسر صاحب نے یہ ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے کہ پاکستان اپنے مصارف کا کبھی کفیل نہیں ہو سکتا، اور وہ ہندوستان سے علیحدہ ہو کر بھی ہندوستان کا دست نگر رہے گا، اس لئے یہ نظریہ غیر دانش مندانہ اور ناقابل عمل ہے۔ ہم ایسے تمام معترضین سے گذارش کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ رائے مرتب کرنے میں جلد بازی اور خام خیالی سے کام لیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جو رقوم پاکستان اپنے مصارف کے لئے مرکزی حکومت سے وصول کرتا ہے ان سے کہیں زیادہ وہ مرکزی خزانہ میں داخل کرتا ہے تو گویا مجموعی حیثیت سے ہم خسارہ میں رہتے ہیں۔ جب پاکستان علیحدہ ہو گا تو دولت کی وہ نہر جو اب گنگا جمنا کے میدانوں کو سیراب کرتی ہے پاکستان کے میدانوں کو گلزار بنانے میں صرف ہو گی۔

تازہ ترین اطلاعات سے پایا جاتا ہے کہ سندھ اور بلوچستان کے صوبہ جات میں مٹی کے تیل کے چشمے برآمد ہوئے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہاں سے اتنا تیل دستیاب ہو سکے گا جو کل ہندوستان اور پاکستان کے لئے کفایت کریگا۔ علاوہ ازیں پاکستان کی زمین ہندوستان کی زمین سے زیادہ زرخیز ہے اور اس میں ہر قسم کی پیداوار ہو سکتی ہے۔ بلوچستان کا ساحل (مکران کا علاقہ) مچھلیوں کے لئے مشہور ہے۔ اس صنعت کو بھی فروغ دیا جا سکتا ہے۔ جنگلات اور ان سے متعلقہ صنعتوں کو بھی ترقی دی جا سکتی ہے

یہ ذرائع آمدنی گو سردست ہمارے لئے بالکل بے کار ہیں لیکن ذرا سے اقتصادی شعور اور تدبیر سے ریگ زار کو باغ عدن بنایا جاسکتا ہے۔ گراں بار طرز حکومت اور ملازمین کے گراں قدر مشاہروں میں تخفیف کی جاسکتی ہے۔ ہمارے معدنی ذرائع بھی اُمید افزا ہیں۔ یہاں کوئلہ کی کمی ہے لیکن جہاں تک اس کمی کا تعلق ہے ہمارے دریاؤں نے ہمیں اس سے بے نیاز کر دیا ہے۔ دریا تمام کے تمام برفانی پہاڑوں سے نکلتے ہیں اور اپنے راستہ میں جابجا آبشاریں بناتے ہیں جن سے بجلی کی بے پناہ قوت حاصل کی جاسکتی ہے جو آجکل ہائیڈرو الکٹرک کے نام سے مشہور ہے۔ اسی قسم کے دیگر پاور ہاؤس قائم ہو جانے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بجلی کتنی وافر مقدار میں پیدا کی جاسکتی ہے اور ہم کس حد تک کوئلہ سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ کوئلہ سے بے نیاز کرنے کے لئے مٹی کا تیل اور پٹرول بھی ہمارا معاون ہوگا۔ اور ان سب اشیا کے استعمال سے معدنی صنعتی اور زرعی پیداوار کو آسانی اور کامیابی کے ساتھ بڑھایا جاسکتا ہے۔ اب اگر ایسا نہیں ہو رہا تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ جن ہاتھوں میں پاکستان کی قسمت ہے وہ مخلص اور دیانتدار نہیں اور وہ دل سے پاکستان کو اپنا دست نگر اور محتاج بنانے کے خواہاں ہیں۔

ہم معترضین کی چشم بصیرت وا کرنے کے لئے پنجاب کے سابق فنانشل کمشنر مسٹر ایچ کیلورٹ Mr. H.Calvert کی مشہور تصنیف "پنجاب کی دولت اور فراغت" The Wealth and Welfare of the Punjab سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"آل انڈیا فیڈریشن کا جزو بننے سے پنجاب پر اقتصادی موت طاری ہو جائے گی اور اسکی تمام تر ذمہ داری ان لوگوں پر عاید ہوگی جو غیر پنجابی ہونگے مگر جو مرکز میں براجمان ہو کر مرکز کے مفاد کے لحاظ سے پنجاب کا خون شیر مادر کی طرح پی جائیں گے۔ وفاقی دستور کے ماتحت تقسیم دولت کے جملہ وسائل اغیار کے ہاتھوں میں ہونگے۔ ریلوے، ڈاک، اور تار۔ بری اور بحری ذرائع رسل و رسائل تمام کے تمام صوبائی خود مختاری کے حلقۂ اختیار سے باہر ہونگے حتیٰ کہ پنجاب کی پیداوار کے لئے منڈیاں تلاش کرنا اور اسکو مناسب قیمتوں پر فروخت کرنا اور اس قسم کے دوسرے اہم کام ان کے سپرد ہونگے جنہیں پنجاب سے کوئی ہمدردی نہیں ہوگی

نرخوں کا تعین خارجی اثرات سے انجام پذیر ہوگا اور درآمد اور برآمد کے سلسلہ میں پالیسی سراسر مرکزی حکومت کی ہوگی پنجاب کے لئے سب سے زیادہ خطرناک چیز بمبئی کے کارخانہ داروں کا وہ مہلک اثر ہے جس کے باعث وہ مرکزی حکومت کو محصولات کا لالچ دیکر تحفظ صنعت پر آمادہ کر لیتے ہیں۔ اس کے بہادر اور تنومند باشندے بمبئی کے فریب کار اور خودغرض تاجروں کے سامنے مجبور محض ہوں گے۔ جن کی ہوس رانیوں نے پہلے ہی ہندوستان بھر کے مفاد کو خطرہ میں ڈال رکھا ہے۔ پنجاب فیڈریشن میں اقلیت کی حیثیت سے شامل ہوگا۔ اور فیڈریشن کے ناخداؤں کو اس کی ترقی اور تنزل سے کوئی سروکار نہیں ہوگا اور اگر پنجاب اپنی گذشتہ روایات کا تحفظ اور اقتصادی آبرو کی بقا چاہتا ہے تو اُسے ضرور اکثریت پیدا کرنی چاہیئے اور وہ اکثریت دوسرے ہمسایہ زرعی صوبوں کو اپنے ساتھ ملانے سے ہو سکتی ہے۔

مرکزی حکومت جب اپنے ذرائع آمدنی بڑھانے کے لئے اور بمبئی کے تاجروں کی صنعت کو فروغ دینے کی خاطر بیرونی اشیاء کی درآمد پر بھاری محصولات لگائے گی تو غیر ممالک بھی ہندوستان کی برآمد پر جواباً اسی قسم کی پابندی عاید کرینگے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کی برآمد میں نمایاں کمی ہو جائے گی۔ اور چونکہ ہندوستان کی برآمد کا بیشتر حصہ خام اشیاء پر مشتمل ہے، جو زیادہ تر پنجاب، سندھ وغیرہ جیسے زرعی صوبے مہیا کرتے ہیں۔ اس لئے بائیکاٹ کی زد سیدھی ان صوبوں کی ۸۰ فی صدی آبادی پر پڑیگی جن کا روزگار ان خام اشیاء کی پیداوار پر منحصر ہے اور اغلب ہے کہ ان صوبوں کے جفاکش کسان تنگدستی اور فلاکت کے مرض میں مبتلا ہو کر راہی ملک بقا ہوں اور ان کی سرسبز اور لہلہاتی کھیتیاں ہمیشہ کے لئے خزاں کی نذر ہو جائیں۔

برما نے اپنا مستقبل علیحدہ ہو کر محفوظ کر لیا ہے۔ اب زرعی صوبہ جات کے لئے اپنی یقینی بربادی سے بچنے کی واحد صورت یہی ہے کہ وہ صنعتی صوبہ جات سے علیحدہ ہو کر

اپنی جداگانہ فیڈریشن قائم کریں۔ اگر پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ اور وہ ریاستیں جو این، ڈبلیو، آر، (شمال مغربی ریلوے) سے ملحق ہیں اپنی علیحدہ فیڈریشن قائم کرسکنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ ان خطرناک نتائج سے بچ سکتے ہیں۔ جو لازمی طور پر انہیں مرکزی حکومت کی تجارتی حکمت عملی کے طفیل بھگتنے پڑیں گے۔"

جب ہماری ان واضح حقائق پر نظر پڑتی ہے تو مخالفین کے اعتراضات کی کمزوری ابھر کر سطح پر آجاتی ہے اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ برسوں کے ذاتی تجربہ کی بنا پر کیلورٹ صاحب کی بصیرت کورے "کتاب خواں" ماہرین اقتصادیات کی بصیرت سے کہیں زیادہ ہے۔

یہ تو خیر ہندوؤں کے اعتراضات تھے۔ خود مسلمان بھی جو تحریک پاکستان سے ہمدردی رکھتے ہیں ہم سے سوال کرتے ہیں کہ پاکستان سے باہر جو پانچ کروڑ مسلمان ہندوستان میں بستے ہیں تحریک پاکستان کے پاس ان کی فلاح و نجات کی کیا ضمانت ہے۔ واقعی ان مسلمانوں کا اور ہمارا گوشت اور ناخن کا تعلق ہے اور انکی موجودہ حالت اور آئندہ بہتری ہمارے پیش نظر رہے گی لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے پاکستان کی علیحدگی مسلمانان ہند کے مفاد کے منافی نہیں ہوسکتی اس لئے کہ وہ آبادی کے لحاظ سے اب بھی اقلیت میں ہیں یعنی ۱/۲ ۳۲ فی صدی کی نسبت سے ہیں اور آئندہ بھی اقلیت میں رہیں گے جب ان کی نسبت ۱/۲ ۱۷ فی صدی ہوگی۔ البتہ آئندہ کے لئے ان کی حفاظت کی مؤثر ضمانت یہ ہے کہ پاکستان میں ہم غیر مسلم اقلیتوں کو جس قسم کی مراعات کھلے دل سے دیں گے ہم توقع رکھیں گے کہ اسی قسم کی مراعات "ہندوستان" میں ہمارے مسلم بھائیوں کو ملیں۔ ہم پاکستان کا تحفظ اس لئے کر رہے ہیں کہ ملت اسلامیہ کا بہیئت مجموعی اس میں فائدہ ہے۔ پاکستان پر ہندوستانی مسلمانوں کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہمارا ہے۔ کیونکہ وہ ہماری ملی جائے پناہ اور ان کا اخلاقی سہارا ہوگا۔ ہمارا ہندوستان سے کٹ جانا ہندی مسلمانوں سے کٹ جانے کے مرادف نہیں سمجھنا چاہیئے مسلمانوں کے باہمی تعلقات کے راستہ میں جغرافیائی حدود بندی کوئی شے نہیں جنوبی افریقہ کا مسلمان اور بحر منجمد شمالی کا مسلمان ملت اسلامیہ کے محکم و استوار رشتہ میں منسلک ہونے کی وجہ سے ایک ہی جسم کے دو

حصے ہیں اس لئے ہم میں اور ہندی مسلمانوں میں کوئی بُعد نہیں ہوگا کوئی چیز ہمارے راستہ میں حائل نہیں ہوگی۔

ہم اپنے ہندو معترضین کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے عزائم غاصبانہ نہیں۔ پاکستان کے ہندو اور مسلمان اپنے ملک کی خوشحالی اور مصیبت میں برابر کے شریک اور حصہ دار ہونگے مسلمان جو اکثریت میں ہونگے انشاءاللہ اپنے عمل سے ثابت کر دکھائیں گے کہ طاقت اور قوت ان کے دماغ میں نخوت اور غرور نہیں بلکہ خدمت خلق کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے وہ انڈین نیشنل کانگریس نہیں کہ اقلیتوں کے جذبات سے اغماض کریں اور اُن کے حقوق پامال کریں۔ وہ اپنے حقوق سے زیادہ برادران وطن کے حقوق کی محافظت کرینگے۔ اس لئے کہ ان کا مذہب انہیں اس امر کی تعلیم دیتا ہے اور ان کی گذشتہ تاریخ ان کی اس قومی خصوصیت کی تفسیر ہے۔

پاکستان کی حیثیت اور طاقت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ہم یہ بھی ناظرین کو بتانا چاہتے ہیں، کہ پاکستان کی آبادی چار کروڑ ہے جس میں سے تین کروڑ بیس لاکھ مسلمان ہیں۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کا تقریباً دسواں حصّہ ہیں۔ مزید براں جمعیت الاقوام کے چوّن ارکان میں سے اکیاون۔ رقبہ اور آبادی دونوں میں پاکستان سے کم ہیں۔ پاکستان کا رقبہ اٹلی سے چار گنا، جرمنی سے دوگنا، فرانس سے دوگنا سے زیادہ اور برطانیہ سے کئی گنا زیادہ ہے اور اس کی آبادی آسٹریلیا سے سات گنی، کنیڈا سے چار گنی، سپین سے دوگنی اور فرانس سے کچھ زیادہ ہے۔

ہم مضمون کو چودھری رحمت علی صاحب کے الفاظ میں ختم کرتے ہیں جو ترکی کی شہرۂ آفاق خاتون خالدہ ادیب خانم کی کتاب "درون ہند" Inside India. سے ماخوذ ہیں اُنہوں نے اسلامی ہند کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان نیشنل تحریک پر ایک باب باندھا ہے اور اس سلسلہ میں چودھری صاحب سے پیرس اور لندن میں دو دفعہ ملاقات کی ہے۔ اور پاکستان کا باب اُنہی ملاقاتوں کا نتیجہ ہے۔ جامع اور طویل باب میں سے ہم چند سطور ذیل میں درج کرتے ہیں۔

"ہماری تجویز ایک آزاد اور علیحدہ پاکستان کا تصور ہے جو شمال کے پانچ صوبوں پر مشتمل ہو

اور جس کا سیاسی درجہ دیگر مہذب اقوام کے برابر ہوگا۔ ہمارا یقین ہے کہ یہ حل دونوں قوموں (پاکستان کے مسلمان اور ہندوستان کے ہندو) کیلئے آبرومندانہ زندگی کا تحفظ کریگا اور دونوں کو برطانوی شاہنشاہیت کا آلہ کار بننے سے بچائے گا ........ ہم ہندوستانی نہیں پاکستانی ہیں اور ہمارا ہندوستان میں مدغم ہونا سیاسی موت کے مترادف ہوگا۔ کیا تاریخ عالم میں ایسی ایک بھی مثال ملتی ہے کہ ایک قوم نے ہمسایہ قوم کے اتحاد کے لئے ملّی خودکشی کی ہو۔ شکست ایک لعنت ہے، لیکن بغیر مقابلہ کے ہتھیار ڈال دینا گناہِ عظیم ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ برطانوی راج اور ہندو وطن پرستی اپنی مخصوص مصالح کی خاطر ہم سے متحدہ ہندوستان کے نام پر قومی خودکشی کی توقع رکھتی ہے، لیکن ایسا ہونا قبیل محالات سے ہے۔ ہندوستان کو متحد کرنا علیحدہ بات ہے۔ لیکن پاکستان کو غصب کرنا اور بات۔ یہ ہم کبھی گوارا نہیں کر سکتے ....... ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم کشمکشِ حیات میں چند در چند مصائب میں مبتلا ہیں۔ لیکن یہ درخشاں حقیقت ہم فراموش نہیں کر سکتے کہ ہمارے آباؤاجداد نے اس سرزمین میں ان سے کہیں زیادہ عظیم الشان مصائب کا نہایت جوانمردی اور کامیابی سے مقابلہ کیا تھا ہمارا مستقبل پاکستان سے وابستہ ہے اور ہم اسے زندگی اور موت کا سوال سمجھتے ہیں ہمارا عقیدہ ہے کہ تقدیر نے ہمیں پاکستان کے تحفظ کیلئے انتخاب کیا ہے اور یہی چیز آئندہ نسلوں کو ورثہ میں ملیگی۔ امروز شاید ہمارا مذاق اڑائے لیکن ہماری آنکھیں صبح فردا کے اس دلفریب خندہ کا نظارہ کر رہی ہیں جس کے حسین پردہ سے ہماری کامرانیوں کا مہرِ منیر طلوع ہوگا اُس صبحِ امید کی نمود تک ہم نومیدیوں کی شبِ تار کو اپنی قربانیوں کے نور سے روشن رکھیں گے اور اسلام کے سچے فرزندوں کی طرح ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے ..........

دیگر اقوام عالم کی طرح ہمارے سامنے بھی خدمتِ خلق کا معین مقصد ہے اور وہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ہم پاکستانی روح کو منزہ اور محفوظ رکھیں۔ اندریں حالات اگر ہم قومیت متحدہ ہندیہ کے بزعم خود غلط اور خطرناک نظریہ کے لئے اپنے ہی قتل نامہ پر دستخط ثبت کردیں تو یہ آئندہ نسلوں سے غداری اپنی تاریخ سے صریح ظلم اور انسانیت کے خلاف گناہِ عظیم ہوگا اور اس سے نجات اور برأت ناممکن !!" (حمید پاک[1])

---

[1] پاکستان کے انتساب کی بنا پر +

# مسجد کا مکمل تصور

(جناب محمد اسد خاں صاحب اسد بی اے)

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ چند معمولی سے الفاظ میں دین کی بڑی بڑی باتوں کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں۔ پہلی نظر میں وہ اشارہ محض عام خیال کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں اس پر غور کیا جائے وہ گنجینۂ معنی کی طلسمی کلید ثابت ہوتا ہے جس سے حقایق و معارف کا ایک نیا باب کھُل جاتا ہے اور جو تصوّرات ذہن میں پہلے سے بھی موجود ہوں اُنکے بعض دُھندلے پہلو اِس طرح روشن ہو جاتے ہیں کہ مجموعی طور پر تمام تصور ہی بالکل نیا محسوس ہونے لگتا ہے اسکے بعد جب اپنے خیالات کا جائزہ لیا جائے تو دل کی نگاہ کا زاویہ ہی بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی ہے علامہ اقبالؒ کی وہ "قلندرانہ کرامات" جسے وہ کیمیاگری کے مقابلہ میں پیش کرتے ہیں ؎

قلندر ہیم و کراماتِ ما جہاں بینی است
زمانہ نگاہ طلب کیمیا چہ می جوئی!

ذرا سے اشارہ کے ساتھ نگاہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دینے کی ایک مثال حضرتِ علامہؒ کی اس رُباعی میں بہ آسانی مل سکتی ہے جس میں انہوں نے مسجد کے صحیح اور مکمل اسلامی تصور کی طرف رہنمائی کی ہے۔ عام طور پر مسجد کا لفظ سُنتے ہی ایک مخصوص ہیئت کی عمارت کا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ فقہ یا قانون کی رُو سے بھی مسجد سے وہ عمارت ہی مراد ہوتی ہے جو نماز کے لیئے وقف کردی گئی ہو۔ چونکہ شریعت کا نفاذ ظاہر ہی ہوتا ہے اِس لیئے جہاں تک ظاہری اور مادّی صورت کا تعلق ہے۔ مسجد کا اطلاق محض عمارت پر ہے اور

عمارت ہی کا تحفظ و انتظام اور تقدس و احترام مسلمانوں پر ہر لحاظ سے لازم آتا ہے۔

یقیناً عمارت کا تصور مسجد کا عام اور بظاہر بالکل صحیح تصور ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کیا یہ مسجد کا مکمل تصور بھی ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے حضرت علامہ کے ان اشعار کی روشنی میں غور کیجیے۔ فرماتے ہیں ؎

مسلماناں بخویشاں در ستیزاند | بجز نقشِ دوئی بر دل نریزند
بنالند ار کسے خشتے بگیرد | ازاں مسجد کہ خود ازوے گریزند

دوسرا شعر خاص طور پر توجہ طلب ہے، بظاہر تو صرف اتنا کہا گیا ہے کہ "مسلمان چلا اُٹھتے ہیں اگر کوئی ایک اینٹ بھی اُس مسجد سے نکال لے جس سے کہ وہ خود بھاگتے ہیں" لیکن اسی ایک شعر میں نہ صرف مسجد کے عام تصور پر تبصرہ کیا گیا ہے، بلکہ اُسکے مکمل تصور کیطرف بھی توجہ دلا دی گئی ہے، عام تصور کی نمائندگی تو "خشت" کا لفظ کر رہا ہے اور مکمل تصور کا اشارہ "خود ازوے گریزند" کی دل دوز طنز کے اندر چھپا ہوا ہے۔

مسجد کے اس مکمل تصور کو پوری طرح ذہن نشین کرنے کے لیے وجودِ انسانی کا استعارہ غالباً مفید رہے گا جس طرح ہم عام طور پر انسان کو جسم اور روح یا ظاہر اور باطن کے مجموعے سے تعبیر کرتے ہیں اسی طرح گویا مسجد کا بھی ایک جسم ہے اور ایک روح۔ ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، مسجد کا جسم تو ہے یہی عمارت وہ کسی بڑے شہر کی گنبدوں اور میناروں والی عظیم الشان عمارت ہو۔ کسی محلے میں محض ایک دالان اور صحن پر مشتمل ہو یا کسی گاؤں میں ایک مختصر سی چار دیواری ہو جسکے چاروں کونوں پر مٹی کے تودے رکھ کر اُسے امتیازی صورت دی گئی ہو۔ لیکن مسجد کی روح درحقیقت مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جو اپنی نمازوں سے اس عمارت کو آباد کرتی ہے جس طرح پیکرِ مسجد صحن و محراب۔ در و دیوار اور گنبد و مینار سے ترکیب پاتا ہے اسی طرح روحِ مسجد کے اجزائے ترکیبی وہ افراد ہیں جنکے ملنے سے جماعت کی تشکیل ہوتی ہے اور ملت کی بنیاد پڑتی ہے یہ ہے مسجد کا تصور جسکے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کے جماعت سے گریز کرنے سے بھی اسی طرح تکلیف محسوس ہونے لگتی ہے۔ جس طرح مسجد کی عمارت کو صدمہ پہنچنے کی صورتیں

اِس تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو گویا وہ غیر آباد مسجد جس میں نماز نہ ہوتی ہو ایک پیکرِ بے جان ہے اور وہ جماعت جو کسی کھلے میدان میں نماز ادا کر رہی ہو۔ ایک روحِ بے جسم۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے شرعی نقطۂ نظر سے غیر آباد مسجد بھی بہر حال مسجد ہے۔ اور اس سے اسکے تقدس و احترام میں کچھ فرق نہیں آتا۔ اسی طرح کھلے میدان کی نماز بھی ہر لحاظ سے نماز ہے اور کسی مسجد کے اندر ادا نہ ہونے کے باعث اسکی حیثیت میں ذرا بھی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن با ایں ہمہ مسجد کے صحیح تصور کی تکمیل کے لیے مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں یعنی عمارت اور جماعت دونوں کی موجودگی ضروری ہے۔

مسجد کے اس ظاہری و معنوی تصور کے پیشِ نظر مسجد کی عمارت کے تحفظ کے ساتھ جماعت کا انتظام بھی تکمیل مسجد کا لازمی جزو بنجاتا ہے مثلاً اگر کسی محلے میں پچاس بالغ و عاقل مسلمان رہتے ہیں تو اس محلے کی مسجد کو معنوی طور پر اُسوقت تک مکمل نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ یہ پچاسوں مسلمان اس مسجد میں باجماعت نماز ادا نہ کرتے ہوں۔ اگر جماعت میں ایک مسلمان بھی کم ہوتا ہو تو اس کمی کو اسی طرح محسوس کرنا چاہیے جس طرح کہ مسجد کی عمارت کے کسی حصّہ کو تشنۂ تکمیل دیکھ کر۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اگر مسجد کے صحن کی دیوار کا ایک ٹکڑہ بھی ادھورا پڑا ہو یا گر گیا ہو تو اہل محلہ اسکو پورا کرنے کیلئے بیتاب ہوتے ہیں سرمایہ بہم پہونچاتے ہیں اور اسوقت تک اُن کو اطمینان نہیں ہوتا جب تک وہ دیوار مکمل نہ ہو جائے۔ لیکن اُسکے برعکس اگر آدھے سے زیادہ اہل محلہ بھی شریک جماعت نہ ہوتے ہوں تو چنداں احساس نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو ہوتا بھی ہے تو محض زاہدانہ شکایت کے طور پر نہ کہ اِس نقطۂ نظر سے کہ ان کی عدم شرکت سے مسجد کی معنوی تکمیل نہیں ہو رہی۔

ظاہر ہے کہ مسجد کے اس تصور سے نماز باجماعت کی اہمیت کچھ اور بڑھ جاتی ہے گویا عذرِ معقول کے بغیر کسی مسلمان کا باجماعت نماز میں شریک نہ ہونا محض اُس کا انفرادی فعل نہیں رہتا۔ بلکہ اسکی یہ کوتاہی مسجد کی معنوی تکمیل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لہذا باقی مسلمانانِ محلہ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اور نہیں تو کم از کم اپنی مسجد کی تکمیں ہی کی خاطر اُس مسلمان کو شریک جماعت کرنے کی عملی کوشش کیطرف متوجہ ہوں۔ ایک حلقۂ مسجد میں اس باہمی ذمہ داری کے احساس سے جو بے شمار فوائد مترتب ہو سکتے ہیں انکا اندازہ ہر صاحب فہم بآسانی

لگا سکتا ہے۔

مسجد کے اِس معنوی پہلو کو نمایاں کرنیکا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مسجد کی ظاہری صورت یعنی عمارت کی اہمیت کو کم کیا جائے۔ مسجد کی عمارت کے تقدس و احترام میں کسی طرح بھی کمی نہیں ہو سکتی اگر کسی مسجد میں سالہا سال بھی نماز نہیں پڑھی گئی تو بھی وہ مسجد ہے اور پوری مسجد وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اور اسکی اِس حیثیت میں کبھی فرق نہ آنا چاہیئے۔ لیکن افادی پہلو سے ایک غیر آباد مسجد کی بہ نسبت ایک آباد مسجد یقیناً بہتر سمجھی جائیگی۔ اور پھر آباد مساجد میں وہ مسجد اتنی ہی افضل رہے گی جس میں جماعت کی زیادہ تکمیل ہوتی ہو۔ مسجد کی جس معنوی تکمیل کی طرف اس مختصر سے مضمون میں متوجہ کیا گیا ہے اور مسجد کے جس مکمل تصوّر کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے اگر اسکے معیار سے جانچا جائے تو یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ ہماری لاکھوں اور کروڑوں مسجدوں میں سے کتنی ایسی ہوں گی جنہیں "مکمل" کہا جا سکے۔

اسلام نے بنی نوع انسان کے لیئے تنظیم کی جو صورت پیش کی ہے اُسکی بُنیاد مساجد پر رکھی ہے مُسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کا آغاز مسجد ہی سے ہوا اور مساجد ہی کے ذریعہ اسلامی نظام کو وسعت اور عروج حاصل ہوا۔ آج اس گئی گذری حالت میں بھی اگر اسلامی جمعیت کے شیرازۂ اخوت کو کوئی چیز کسی حد تک برقرار رکھے ہوئے ہے تو وہ یہی سلسلۂ مساجد ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مسجد کا صحیح اور مکمل تصوّر دل کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ مساجد کی کثرت ہمارے مِلّی نظام کے حلقوں کو مربوط و مضبوط کرنے کے بجائے قومی انتشار کا باعث بن گئی ہے۔ وہی مسجد جسے اسلامی اُخوت و اجتماعیت کی رُوح کا مرکز اور تربیت گاہ ہونا چاہیئے۔ باہمی جھگڑے افتراق اور "فی سبیل اللہ فساد" کا گہوارہ بنکر رہ گئی ہے۔

مسلماناں بخویشاں در ستیزاند	بجز نقشِ دوئی بر دل نریزند
بنا لند ار کسے خشتے بگیرد	ازاں مسجد کہ خود ازوے گریزند

# پردہ

جناب مولوی عزیز الحق صاحب۔ بی اے۔ بی ٹی۔ نئی دہلی

پچھلے دنوں انگریزی کے مشہور روزنامہ "اسٹیٹسمین" میں ایک دلچسپ بحث پردہ کے عنوان پر شائع ہوئی ہے جو اگرچہ بعض مواقع پر معیار متانت سے گر گئی ہے۔ تاہم توجہ کے لائق ہے۔ بحث کی ابتدا ایک پردہ دار خاتون کے بیان سے ہوئی جس نے دیانتداری اور صفائی کے ساتھ اعتراف کیا کہ پردہ سے باہر نکل کر ارتباطِ جنسی کی وہ جنت اس کو مل گئی جس کا خواب بھی اس نے پردہ میں نہ دیکھا تھا۔ رقص و سرود کی محفلوں میں اس کی کمر نے مردانہ ہاتھوں کا لمس محسوس کیا اور اپنی ہستی کو توجہات کا مرکز پا کر اسکو یقین ہو گیا کہ زندگی کا لطف اگر ہے تو اسی میں ہے۔ کہ ع

کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

پردہ در طبقہ میں اس بیان کو "راز بیرون پردہ" کا افشا قرار دے کر اس صاف گو خاتون کو ہدف ملامت بنایا گیا۔ اور بحث اس امر پر چھڑ گئی کہ پردہ محض ہوائے نفسانی کی خاطر ہی ترک کیا جاتا ہے یا اس میں اور بھی کوئی مصلحت ہے؟

پردہ کے مخالفین میں سب سے زیادہ صاف گوئی سے کام کلکتہ کے ایک بزرگ مسٹر آر۔ این حسین صاحب نے لیا۔ انہوں نے فرمایا کہ جو عورتیں پردہ سے باہر آکر بھی گاہ بگاہ رقص کرنے اور تھوڑی بہت شراب پینے کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ ان کے لئے بہتر ہے کہ وہ پس پردہ ہی رہیں کیونکہ سوسائٹی کو اگر ان کی ذات سے اتنا بھی نشاط حاصل نہ ہوا تو ان کا پردہ توڑنا محض بیکار ہے مسٹر حسین کی بات میں ایک برجستگی و بیساختگی کی جھلک ہے جو یقیناً داد کی مستحق ہے دیگر مخالفین نے وہی پامال اور فرسودہ دلائل پردہ کی مخالفت میں پیش کئے یعنی پردہ کے اندر عورت تازہ ہوا اور دھوپ سے محروم رہ کر تندرست نہیں رہ سکتی۔ پردہ میں اکتساب علم و ہنر نہیں کر سکتی اپنی روزی آپ نہیں کما سکتی، اپنے ماحول سے باخبر نہیں رہ سکتی، قوم کی ترقی میں مرد کا ہاتھ نہیں بٹا سکتی وغیرہ۔ وغیرہ۔ طنزاً یہ بھی کہا گیا کہ پردہ میں خرچ زیادہ ہے۔

پردہ بدصورتی چھپانے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ پردہ میں ارتکاب جرائم بآسانی ہو سکتا ہے موخرالذکر دلائل خود اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ مخالفین کے پاس معقول وجوہ کی کس قدر کمی ہے۔

چونکہ پردہ کے بقا و ترک پر ہماری مستورات کے اخلاق و اطوار خیالات و عادات کا انحصار ہے اور ان کی ذہنیت آئندہ نسلوں کی ذہنیت کی امانتدار ہے یہ مسئلہ زمانہ حال کے مسلمانوں کے لئے ایک نہایت اہم مسئلہ ہے اور اس میں نہایت غور و تعمق کی ضرورت ہے۔

مسئلہ کی شرعی حیثیت نہایت صاف ہے شریعت اسلامی میں پردہ کا حکم مثل اکثر دیگر احکام کے تدریجاً نازل ہوا۔ اول مردوں اور عورتوں کو نظریں نیچی رکھنے۔ اور شرم و حیا برتنے کی ہدایت فرمائی گئی پھر عورتوں کو حکم ہوا کہ علاوہ محارم شرعی اور بچوں اور نہایت بوڑھے مردوں کے اپنی زینتوں کو کسی پر ظاہر نہ کریں۔ علاوہ ان زینتوں کے جنکا کھلا رکھنا لازمی ہو۔ اس حکم عام کے مستثنیات میں چہرہ اور ہاتھوں کو داخل مانا گیا ہے اس پابندی پر بھی جب عورتوں کو ایذا پہونچنے کے واقعات پیش آئے تو شریف عورتوں کو جنہیں کسب معاش کے لئے باہر پھرنا اور منہ کھولنا ضروری نہ تھا ارشاد ہوا کہ اپنی چادروں کو کسی قدر نیچا کر لیا کریں ان احکام کا ماحصل یہ ہے کہ جن عورتوں کو ضروریات زندگی چہرہ کھولنے پر مجبور کریں۔ وہ چہرہ کھول سکتی ہیں بقیہ جسم کو لپیٹے رکھیں اور جنکو کوئی ایسی مجبوری درپیش نہو۔ وہ آج کل کے سے پرفتن زمانے میں چہرہ کو بھی ظاہر نہ کریں۔ چونکہ تفصیل مذکور پر تقریباً تمام علماء فن کا اتفاق ہے ان آیات قرآنیہ کا نقل کرنا جن سے یہ تفصیل مستنبط ہے ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

مسئلہ کی شرعی حیثیت معلوم ہونے کے بعد ایک صحیح العقیدہ مسلمان کے لئے کسی اور دلیل کی حاجت باقی نہیں رہتی کیونکہ حکم خداوندی سے انکار کرنے والا کافر ہوتا ہے اور اس پر عمل نہ کرنے والا گنہگار۔ تاہم مسلمانوں کے مزید اطمینان قلب اور غیر مسلموں کو سمجھانے کے لئے مسئلہ کے عملی اور نفسیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

یہاں بطور مقدمہ اولیٰ کے یہ لکھدینا ضروری ہے کہ پردہ کے تخیل کی اساس اس اصول پر ہے کہ مرد و عورت کی تخلیق جداگانہ فرائض کی انجام دہی کے لئے کی گئی ہے۔ یہ اصول تقریباً مسلمات میں سے ہے

اور اس مضمون کے سمجھنے کی توقع انہی حضرات سے کی جائے گی جو اس سے اتفاق رکھتے ہوں۔ اس سے اختلاف کرنے والوں کو یہاں کوئی مفید شے نہ ملے گی حقیقت مسلمہ کی تردید کا بار اوّل ان کے ذمہ ہے قسام ازل نے جب مناسب فرائض کی تقسیم کی تو مرد کے حصے میں سب سے زیادہ محنت وجانفشانی تدبر وذمہ داری کے کام دیئے مثلاً کسب معاش حفاظت جان ومال عورت کے حصے میں سب سے زیادہ نزاکت، لطافت اور نفاست کے کام آئے مثلاً خانہ داری وتربیت اولاد اسی تقسیم کے مطابق دونوں کو جسم دماغ اور قلب عطا کئے گئے مرد کو مشقت وتکلیف اٹھانے کی صلاحیت بخشی گئی عورت کے اندر صبر وتحمل کا مادہ ودلیعت کیا گیا۔ عورت کو جذبات کا حامل بنایا گیا مرد کو قوت عمل کا۔ تعمیر مرد کے سپرد کی گئی۔ تزئین عورت کے۔

یہ تقسیم کار کوئی خیالی یا رواجی شے نہیں ہے بلکہ عین فطرت کے مطابق ہے عقل سلیم اس کو قبول کرتی ہے مشاہدات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ جن ممالک میں اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے وہاں بھی بجز اعتراف شکست کے کچھ بن نہیں پڑتا۔ مساوات مرد وزن کے حامی اوّل تو کامل مساوات کے حدود سے عملاً ہمیشہ پیچھے رہے۔ لیکن جس حد تک گئے بھی اب تلخ تجربات کے بعد رجعت کرنے پر مجبور ہیں۔ سہ

آنچہ دانا کند کند ناداں ؎ لیک بعد از خرابیٔ بسیار

اس تقسیم عمل میں ہر دو اصناف کی صلاح وفلاح مضمر ہے اور اگر اس کی حقیقت ومصلحت ذہن نشیں ہو جائے تو بہت سے معاشری مسائل نہایت آسانی سے حل ہو جاتے ہیں کسی معاشری مسئلہ پر صحیح فیصلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے حیات انسانی کا مقصد متعین کرلیں اور پھر غور کریں کہ اس مقصد کی تحصیل کے لئے کونسی شے مفید ہے؟ اور کونسی مضر۔ پردہ کے مخالفین آپ سے کہیں گے۔ کہ پردہ نشین عورت جنگ عظیم جیسی ہولناک اور بہیمانہ لڑائیوں میں مرد کی پورے طور پر اعانت نہیں کرسکتی۔ یہ بڑی حد تک صحیح ہے لیکن خدارا پہلے یہ تو طے کرلیجئے کہ کیا انسان کی تخلیق اس لئے کی گئی ہے کہ وہ بہیمیت اور بربریت میں امتیازی ترقی حاصل کرے۔ فتنہ وفساد کی کامل استعداد اپنے اندر پیدا کرے قتل و

غارت اور مردم کشی کے کامیاب ترین انتظامات مہیا کرے۔ ہر عاقل جانتا ہے کہ قدرت کا منشا یہ نہیں ہے۔ انسان کا کمال اسی میں ہے۔ کہ وہ ایسے نظامِ مدنیت و عمران کی بنا ڈالے جس میں خدا کی تمام مخلوق اخلاص و محبت، راحت و مسرت کی زندگی بسر کر سکے البتہ جو قوتیں ایسے نظام کے قیام میں حائل ہوں ان سے جنگ کرنا، اور ان کو فنا کرنا بھی اسی مبارک کوشش کا ایک جزو ہے لیکن اس جنگ کو ان جنگوں سے دور کا واسطہ بھی نہیں جو محض نسل، رنگ، قوم اور وطن کے نام پر لڑی جاتی ہیں۔ جو جہاد حق و انصاف کی حفاظت کے لئے کیا جاتا ہے اس میں مادی قوت اور اسلحہ سے کہیں زیادہ قوتِ ایمانی اور جرأتِ اخلاقی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو فرد یا قوم ان ہتھیاروں سے مسلح ہونا ممکن ہے۔ کہ اسے کوئی مادی قوت صحیح معنی میں زیر کر سکے۔

اگر ان دو چیزوں کو ہم تسلیم کر لیں کہ حیاتِ انسانی کا مقصد قیام صلح و امن ہونا چاہیئے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے جن مساعی کی ضرورت ہے ان کا درشت و کرخت پہلو مرد کے لئے مخصوص ہے اور نرم و نازک پہلو عورت کے لئے۔ تو ہم نہایت آسانی سے اپنے بچوں اور بچیوں کی تربیت و تعلیم کا پروگرام مرتب کر سکتے ہیں۔ نظامِ فطرت جن فرائض کی انجام دہی عورت سے چاہتا ہے۔ ان کے پیشِ نظر یہ نہایت کافی ہے کہ ایک لڑکی ذمہ دارانہ زندگی میں قدم رکھنے سے قبل امور خانہ داری۔ اصول حفظانِ صحت۔ نوشت و خواند حسبِ ضرورت حساب کتاب اور روزمرہ کے مسائل دینیہ سے واقف ہو۔ اوسط درجے کے گھرانوں کیلئے یہ تعلیم و تربیت بالکل کافی ہے اور اس کی تحصیل میں پردہ کسی طرح مانع نہیں ہو سکتا۔ اول تو اس قدر تعلیم ہر گھر میں خود ماں دے سکتی ہے یا باپ اور بھائی دے سکتے ہیں۔ اگر آج نہیں تو دو ایک پشتوں کی کوشش کے بعد ہر ماں یقیناً اس قدر تعلیم دے سکے گی۔ لیکن اگر گھر میں کسی وجہ سے بالکل ہی ناممکن ہو تو نیک اور لائق عورتوں کی نگرانی میں ہر محلہ اور ہر بستی میں پردہ دار مدارس قائم کئے جا سکتے ہیں جیسا کہ زمانہ قدیم میں رواج تھا اور اب بھی اکثر مقامات پر ہیں۔ دولتمند اور صاحب استطاعت گھرانوں میں معیارِ تعلیم کو اور بھی بلند کیا جا سکتا ہے۔ اور لڑکیوں کو اعلےٰ ادب تاریخ سیاسیات دینیات وغیرہ بھی پردہ کے معقول انتظام کے ساتھ سکھائے جا سکتے ہیں لہٰذا جہاں تک ضروری علم و ہنر کی تحصیل کا

سوال ہے پردہ کی وجہ سے کوئی دشواری نظر نہیں آتی ریاست میسور کے دیوان سر مرزا اسمٰعیل نے جو یقیناً "فاضل دیوبند" نہیں ہیں، حال ہی میں اپنی ایک تقریر میں صاف طور پر اعلان فرمایا کہ ریاست میں پردہ کی وجہ سے تعلیم نسواں کے راستہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔

دوسرا سوال صحت کا ہے۔ ..... کہا جاتا ہے کہ پردہ نشین عورتوں کی صحت خراب ہوتی ہے کیونکہ وہ تازہ ہوا اور دھوپ سے محروم رہتی ہیں اوّل تو شاہدہ یہ ہے کہ جبتک پردہ کی پابندی عام تھی عورتوں کا معیار صحت بہ نسبت زمانہ حال کے جب کہ پردہ کی بندشیں بہت کچھ ڈھیلی ہو چکی ہیں۔ نہایت بلند تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ زمانہ قدیم کی عورتیں گھر کے اندر ہی کافی ورزش جسمانی بھی کیا کرتی تھیں، اچھی خوراک ان کو میسر تھی۔ ان کے قلوب قناعت وسکون کی دولت سے معمور ہوتے تھے ان کی زندگی ایک منظم طریقہ پر گذرتی تھی، ہوا اور دھوپ بھی اس زمانہ کے مکانوں میں آجکل سے زیادہ ملتی تھی، جدید تمدن کی بخوستوں مثلاً دھواں گیس۔ گرد وغبار غیر خالص اشیا خوردنی وغیرہ سے محفوظ تھیں۔ آج صحت بخش غذائیں یا تو میسر نہیں یا تکلفات کی وجہ سے استعمال نہیں کی جاتیں۔ گھر کا کام کاج کرنا عیب شمار ہونے لگا ہے دل ودماغ میں بوالہوسی اور شیطنت نے انتشار پیدا کر دیا ہے ہوش سنبھالتے ہی بچوں کو تکلف، تصنع اور نمائش کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ بلوغ سے قبل عشقیہ افسانے اور تھیٹر و سینما کے رومانی مناظر جذبات کو مشتعل کر دیتے ہیں زندگی نہایت غیر منظم طور پر گذرتی ہے۔ مکانات تنگ وتاریک ہوتے ہیں بالخصوص شہروں کے۔ دور حاضرہ کے زیر پرست نہ فراخ صحن کے شوقین، نہ پارک و باغیچہ کے دلدادہ۔ کرایہ کی ہوس تمام دیگر مصالح پر غالب۔ کرایہ داروں کا یہ حال کہ ریشمی کپڑوں فینسی جوتوں، چائے کے برتنوں سینما اور تماشاؤں پر خرچ کرنے سے کچھ بچے تو زیادہ کرایہ کا مکان لیں۔ عموماً مکان پر آمدنی کا دس فی صدی بھی خرچ نہیں کرتے اور پھر رونا روتے ہیں دھوپ اور ہوا کی قلت کا، غرض یہ کہ اوّل تو صحت کا تمامتر انحصار محض دھوپ اور صرف ہوا پر نہیں ہے دوسرے قدرت کی ان برکات سے بھی پردہ دار عورتیں بہت بڑی حد تک بہرہ اندوز ہو سکتی ہیں بشرطیکہ اس کا اہتمام ضروری سمجھا جائے۔

یہاں تک تو پردہ کی مفروضہ خرابیوں کا ذکر تھا اب رہی پردہ کی ضرورت، تو ہر سلیم الفطرت انسان

سمجھتا ہے کہ تعلقاتِ جنس کے میدان میں انسانوں اور حیوانوں کے مابین جو چیز مابہ الامتیاز ہے۔ وہ وہی چیز ہے جس کو ہماری آپ کی زبان میں عصمت و عفت کہا جاتا ہے اور جس سے مراد یہ ہے کہ مرد و عورت اپنی فطری خواہشات کے پورا کرنے کیلئے کسی ضابطہ و حدود کے پابند ہوں محض نفس کے بندے نہ بن جائیں کہ جس طرح حیوانوں پر جب غلبۂ خواہش ہوتا ہے تو نہ وہاں ماں اور بہن کا امتیاز ہوتا ہے نہ منکوحہ اور غیر منکوحہ کا۔ اگرچہ فطری رقابت کی جھلک بعض حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے لیکن چونکہ قدرت نے ان کو عقلِ کامل عطا نہیں فرمائی وہ حدود و قیود کے بھی مکلف نہیں بنائے گئے تعلقاتِ جنس ہی پر کیا منحصر ہے حیوانات کی دنیا میں ملکیتِ ذاتی کا اصول ہی معدوم ہے نہ کسی حیوان کا کوئی مخصوص مکان ہے نہ زمین نہ دولت۔ یہ شرف محض اشرف المخلوقات ہی کو حاصل ہے کہ ہر ایک فرد اپنی سعی و محنت سے قدرت کی نعمتوں کے ایک حصہ کا بلا شرکت غیرے مالک بن سکتا ہے یہاں سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ جو لوگ اشتراکیتِ مطلق کے حامی ہیں وہ انسان کو حیوانیت کی جانب بلاتے ہیں بہرحال جب یہ معلوم ہو گیا کہ متمدن انسانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ تعلقاتِ جنسی کو چند ضوابط و آئین کا پابند کریں۔ بقول علامہ اقبال رح ؎

دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

تو لازم ہوا کہ مرد و عورت کے درمیان جو ایک فطری کشش و جاذبیت موجود ہے اس کو بے موقعہ کارفرما نہ ہونے دیا جائے بلکہ اس کشش سے وہی فائدہ اٹھایا جائے جس کے لئے قدرت نے اس کی تخلیق کی ہے۔ اس تحفظ و احتیاط کا دوسرا نام پردہ ہے یہ قدرتی کشش صنفِ مقابل کی صورت دیکھنے آواز سننے یہاں تک کہ خیال کرنے سے بھی حرکت میں آتی ہے اور اگر اختلاط و ارتباط کے مواقع بہم پہونچائے جائیں تو نہایت سرعت کے ساتھ قوت پکڑ کر قبضہ و اختیار سے باہر ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ خوبصورت چہرہ کو دیکھکر خواہشات کا پیدا ہونا محض اس وجہ سے ہے کہ ہماری نظریں پردہ کے رواج کے باعث اس کی عادی نہیں ہیں، وہ حقائق کا انکار کرتے ہیں ان کے بعض

ہم خیال ایک قدم اور آگے بڑھے ہیں اور کہتے ہیں کہ برہنہ جسم کو دیکھ کر بھی خواہشات کا پیدا ہونا محض عادت نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس نوع کے خیالات مسخ شدہ ذہنیت کا پتہ دیتے ہیں دراصل جو لوگ پردہ کے خلاف ہیں وہ عصمت وعفت کو حقیقی اہمیت ہی نہیں دیتے اور مغربی تمدّن اور ملحدانہ تخیل نے ان کے فطری احساسات کو کند کر دیا ہے۔ لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے کیا خوب فرمایا ہے کہ ؎

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا، انہیں غصّہ نہیں آتا

"اسٹیٹسمین" والی بحث میں سب سے زیادہ سبق آموز مراسلہ وہ ہے جو ۵ ارفروری کی اشاعت میں ایک مایوس خاوند کی طرف سے شائع ہوا ہے ناظرین کے مطالعہ کے لئے اس مراسلہ کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

"اگر واقعی پردہ تحصیل علوم وفنون اور سلیقہ وہنرمندی کے سیکھنے میں مانع ہوتا ہے تو اس کو یک قلم منسوخ کر دینا چاہئے لیکن اجازت ہو تو کچھ آپ بیتی بھی عرض کر دوں :-

میری بیوی تعلیمیافتہ اور ایک مہذب خاتون ہے۔ چونکہ اس نے باضابطہ مدارس میں تعلیم حاصل کی ہے وہ برج۔ بیڈمنٹن اور باسکٹ بال کھیلنے میں ماہر ہے۔ جدید ترین طریق پوشش سے واقف ہے اخبارات اور ناولوں کا مطالعہ کر سکتی ہے ملکی اور غیر ملکی سیاسیات پر رائے زنی کر سکتی ہے وہ یہ سب کچھ کر سکتی ہے لیکن اس سے زیادہ کی توقع مجھ کو اب اس کی طرف سے نہیں رہی ہے باورچیخانہ کی ابجد سے وہ نابلد اور سینے پرونے سے بالکل بے بہرہ ہے۔ دودھ کا حساب۔ دھوبی کا حساب اور دیگر خانگی حسابات رکھنا اور گھر کی عام نگہداشت میرے فرائض میں داخل ہے جن کو میں چار و ناچار انجام دیتا ہوں۔ کیا کوئی دردمند دوست مجھکو بتائیں گے کہ کیا روشن خیالی اور ترقی کا مفہوم یہی ہے ہٹلر اور مسولینی کے متعلق اس کے "ملفوظات" ممکن ہے کہ یورپ کی موجودہ سیاسی گتھیوں کو سلجھا دیں۔ اور ایک عالمگیر جنگ کو روک دیں لیکن میرا گھر یقیناً نمونۂ دوزخ بن گیا ہے اور میرے قلب و دماغ کا سکون پورے طور پر رخصت ہو چکا ہے"۔

# دیوِ استبداد

دنیا میں غلامی کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک نمایاں شکل تو یہ ہے کہ کوئی شخص زور بازو سے دوسرے کو مغلوب کرلے اور یوں اُسے اپنی مرضی کے تابع رکھے۔ ہر چند یہ غلامی کی بدترین صورت ہے لیکن اس میں غلامی صرف جسم اور بدن کی ہوتی ہے۔ اگر مغلوب و مفتوح کی فطرت صالح ہے تو اُس کی روح ہر وقت اس اندازِ زندگی سے اِبا کرتی رہیگی۔ اس کی ضمیر اُسے کبھی اطمینان سے بیٹھنے نہ دیگی۔ اور اس کے سینہ میں ہر وقت اس غیر فطری زندگی کے خلاف بغاوت کے جذبات موجزن ہوتے رہینگے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ جذبات کبھی اتنے قوی ہو جائیں کہ انسان یا تو غلامی کے یہ طوق و سلاسل کاٹ کر پھینکدے یا اس جدّوجہد میں اپنی جان دیدے۔

لیکن غلامی کی ایک دوسری شکل ہے جو صورتِ مذکورہ سے بالکل مختلف ہے اور نتائج کے اعتبار سے کہیں مہیب تر۔ جورو استبداد کی غلامی کسی کے سر پر بنوکِ شمشیر مسلط کی جاتی ہے۔ لیکن یہ وہ غلامی ہے جو انسان برضا و رغبت۔ ہنسی خوشی اختیار کرتا ہے۔ قوت اور طاقت کی غلامی میں گرانبار اغلال و سلاسل زبردستی پہنائے جاتے ہیں لیکن اس غلامی میں انسان طوق و زنجیر کو مقدس اور پوتر سمجھ کر خود اپنے ہاتھوں سے پہن لیتا ہے۔ اور اس کے بعد ان کی اسقدر حفاظت کرتا ہے کہ جان جائے لیکن طوقِ غلامی نہ اُترنے پائے۔ ظلم و قہر کی غلامی میں روح ہمیشہ اس طرزِ زندگی پر لعنت بھیجتی رہتی ہے۔ اور ہر وقت اس سے آزاد ہونیکی کوشش کرتی رہتی ہے لیکن اس غلامی میں قلب کو پورا پورا اطمینان اور ضمیر کو کامل تسکین ہوتی ہے۔ اور اس سے آزادی ملنا جہنم کی آگ نظر آتا ہے۔ قاہر جابر کو غلامی کی زنجیریں مضبوط رکھنے کے لئے قوت اور طاقت کے بڑے بڑے سامان فراہم کرنے پڑتے ہیں۔ اور ہر وقت خیال رکھنا پڑتا ہے کہ یہ رسیاں کہیں ڈھیلی نہ پڑ جائیں لیکن اس دوسری قسم کی غلامی میں آقا کو کسی قسم کے سامان و انتظام کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسکے غلام بے طوق و زنجیر اور

بلا اغلال و سلاسل جکڑے رہتے ہیں۔ اور اگر زنجیر کی کوئی کڑی کہیں سے ڈھیلی ہوتی نظر آتی ہے تو یہ اُسے خود اپنے ہاتھوں کس دیتے ہیں۔

آپ شاید متعجب ہوں کہ یہ کس قسم کی غلامی ہے؟ لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو وہ غلامی ہے جو آپ کے گرد و پیش ہر جگہ موجود ہے۔ یہ وہ غلامی ہے۔ جسے "شخصیت پرستی" کہتے ہیں اور جو کسی کی عقیدت اور تقدس کے رنگ میں قلب اور دماغ پر غیر محسوس طور پر چھا جاتی ہے۔ اور روح زندگی بنکر خون کے ہر ذرے میں حلول کر جاتی ہے۔ جو آقا اس انداز سے "معبود" بنتا ہے اسے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرنا پڑتا کہ تقدس و عظمت کا ایک خوش رنگ اور نظر فریب چولہ پہن لے کہ نگاہیں اس کے حسین و جمیل نقش و نگار میں اُلجھ کر رہ جائیں۔ اور انہیں کسی دوسری طرف دیکھنے کا یارا ہی نہ رہے۔ اور اسکے بعد اتنی احتیاط رکھے کہ چولہ کے کسی گوشہ کا رنگ پھیکا نہ پڑنے پائے۔ اس میں کامیاب ہو جائے تو پھر بندوں پر خدائی کرے۔

---

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبودیت اور غلامی کی یہ شکل قدیم زمانۂ جہالت میں رواج پذیر تھی۔ اور آج بھی اس کا امکان صرف وہیں ہو سکتا ہے جہاں جہالت اور توہم پرستی ہو۔ روشن خیال طبقہ میں یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان برضا و رغبت کسی دوسرے انسان کا غلام بن جائے لیکن حقیقت اسکے خلاف ہے۔ آج کا روشن خیال۔ آزادی کا مدعی انسان بھی اس خوئے غلامی میں ایسا ہی پختہ ہے جیسا آج سے بہت دُور پہلے کا جاہل اور توہم پرست انسان۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم۔ جواں ہیں لات و منات

دور کیوں جائیے۔ خود ہندوستان میں دیکھئے کہ یہ "انسان پرستی" کیا تماشا دکھا رہی ہے۔ گاندھی جی کا مسٹر سے مہاتما بننا چولہ بدلنے کے مرادف تھا۔ انکی نگہۂ ژرف بیں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ جو قوم پتھروں کو سجدہ کرتی ہے۔ سانپ اور بیل کو دیوتا بنا لیتی ہے۔ جو انسان عام سطح سے ذرا بلند

ہو۔ اُسے اوتار قرار دیکر خدا سمجھ لیتی ہے۔ اس قوم کا "معبود" بنجانا کچھ مشکل نہیں۔ اُدھر انہوں نے چولہ بدلا۔ اِدھر پیشانیاں زمین بوس ہوگئیں۔ اور تمام قوم نے "انہیں خدا" بنا لیا۔

---

آپ کسی کو دو دفعہ جھک کر سلام کیجئے۔ پھر دیکھئے اس کے دل میں جذباتِ رعونت کس طرح مچلنے لگتے ہیں۔ اور جسے "معبود" ہی بنا لیجئے! تو پھر اس کی انانیت کا کیا پوچھنا!! وہ اپنے آپ کو عام انسانی سطح سے بلند تر سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ہر لفظ کو قانون قرار دیتا ہے۔ جس سے سرتابی کی کسی کو مجال نہیں ہوسکتی۔ جب کوئی قوم اپنے میں سے کسی انسان کو یہ حیثیت دیدے تو پھر وہاں اصول و قانون۔ آئین و دستور سب ختم ہو جاتے ہیں اور جو معاملہ سامنے آتا ہے اس کیلئے سب سے پہلے نگاہیں اس دیوتا کی طرف اٹھتی ہیں کہ اسکی بارگاہِ قدس سے کیا ارشاد ہوتا ہے۔

---

ہندوستان میں کانگریس اصولِ جمہوریت کی مدّعی ہے۔ لیکن ہندو قوم میں مہاتما گاندھی نے جو پوزیشن اختیار کر رکھی ہے اس کی رُو سے یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی بات اُن کی مرضی کیخلاف ہو جائے۔ وہ خود کانگریس کے چار آنے والے ممبر بھی نہیں لیکن تمام کانگریس انکی ذات کے اندر سمٹی ہوئی ہے۔ وہ کانگریس کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ مختارِ کُل ہیں۔ مطلق العنان آمر ہیں۔ بایں ہمہ کانگریس جمہوریت کی مدّعی ہے۔

---

کانگریس کے یہ دیوتا اپنی مملکت میں بے کھٹکے حکومت کر رہے تھے۔ ہر شخص کی گردن ان کے حکم کے سامنے جھکی ہوئی تھی۔ اگر کسی نرمآن یا کھرے نے اظہارِ عبودیت میں ذرا سا بھی تساہل یا تغافل برتا تو انہیں یوں مسل کے رکھد یا جس طرح شری بدری ناتھ کی رتھ کے نیچے یاتری کچلے جاتے ہیں۔ آزادی اور جمہوریت کے دعوے کی تذلیل کے لئے اس قسم کے بہت سے واقعات آپکو مل جائینگے۔ لیکن جو واقعہ ابھی حال ہی میں ہوا ہے

اس نے تو عہدِ جہالت کے ظلم و استبداد کے افسانوں کو بھی مات کر دیا ہے۔ مہاتما گاندھی نے محسوس کیا کہ صدرِ کانگریس مسٹر بوس کے سینہ میں آزادی کی روح کروٹیں لے رہی ہے۔ جو ممکن ہے کچھ دور آگے جا کر انکی "خدائی" کے راستہ میں روڑا بن جائے۔ لہٰذا انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کانٹا کو شروع سے ہی الگ کر دینا چاہیئے۔ انتخابِ صدر کا مسئلہ پیش ہوا۔ مہاتما گاندھی نے اشارات وکنایات سے سمجھا دیا کہ مسٹر بوس کو فوراً ہی الگ ہو جانا چاہیئے۔ نہ معلوم مسٹر بوس ان اشارات کو سمجھ نہ سکے یا انکی نگاہ اس انکار کے نتائج وعواقب تک نہ پہنچ سکی۔ وہ اس سے دستکش نہ ہوئے۔ مہاتما جی نے مقابلہ میں اپنا آدمی کھڑا کر دیا۔ اصول کے مطابق آرا شماری ہوئی اور مہاتما جی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب انہوں نے دیکھا کہ اکثریت مسٹر بوس کے حق میں نکلی۔ نشۂ حکومت میں مخمور دیوتا اپنی خدائی کے قصرِ مقدس میں اس قسم کا تزلزل کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ شکست! اور عمر بھر میں پہلی شکست!! بغاوت! اور ایسی کھلی ہوئی بغاوت!! غم و غصہ سے خون کھولنے لگ گیا۔ آنکھوں سے قہر اور جلال کے شعلے نکلنے لگے۔ شانتی اور اہمسا کے بھیگے ہوئے بادلوں میں جذباتِ انتقام کی بجلیاں تڑپنے لگیں۔ دیوتا کے مقدس استھان سے آواز آئی کہ

> بوس! یہ شکست مسٹر سیتارامیہ کی شکست نہیں۔ ہماری شکست ہے۔ ڈرو ہمارے قہر سے۔ خوف کھاؤ ہمارے انتقام سے۔ دیوتاؤں کا شراپ (بددعا) کبھی خالی نہیں جایا کرتا۔

---

کانگریس کا سشن قریب آگیا۔ مسٹر بوس سخت بیمار ہو گئے۔ لیکن کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے استعفے صدر کے پاس بھیج دیئے اور اُس سے یکسر عدم تعاون کر لیا کہ جو مہاتما جی کی بارگاہ سے ٹھکرا دیا جائے۔ اس کے ساتھ تعاون کرنے والا بھی ملیکش ہو جاتا ہے۔ سشن قریب تر آگیا۔ اور مہاتما جی نے راجکوٹ کا معاملہ سامنے رکھ کر "مرن برت" کا اعلان کر دیا۔ اور یوں دنیا بھر کی توجہات اپنی طرف مرکوز کر لیں۔ پجاریوں نے دیوتا کے حضور اپنی شردھا (عقیدت) کا ایسا ہون جلایا کہ بوس

بچارا اس کے دھوئیں میں گم ہو کے رہ گیا۔ سشن شروع ہو گیا اور برت بھی ٹوٹ گیا۔ مہاتما جی نے کانگریس کو اپنی اشیرباد (دعا) بھیجی۔

---

سشن کے پہلے ہی روز ایک ریزولیوشن پیش ہو گیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ کانگریس ایسی پالیسی پر چلے گی جو مہاتما جی تجویز کرینگے۔ اور صدر کو مجلسِ عاملہ کے اراکین کا انتخاب مہاتما جی کی مرضی کے مطابق کرنا ہو گا۔

کون صدر۔ ایک جمہوری ادارہ کا صدر۔ اکثریت کا منتخب کردہ صدر۔ کانگریس کا آئین و دستور جسے اختیارات دیتا ہے کہ مجلس عاملہ کا انتخاب اپنی مرضی کے مطابق کرے۔

اور کون مہاتما جی۔ جو کانگریس کے ۴ر والے ممبر بھی نہیں ہیں۔

ریزولیشن مجلس مضامین میں پیش ہوا۔ جمہوریت ایک کونے میں سر برہنہ نوحہ خواں تھی۔ آزادی دوسرے گوشے میں با چشمِ نم ماتم کناں تھی۔ آئین و ضوابط انسان کی اس ذہنی غلامی پر خندہ زن تھے۔ حریت و مساوات۔ عقیدت و تقدس کے قفس میں محبوس پڑی پھڑپھڑا رہی تھی۔ ریزولیشن پر بحث و تمحیص ہوئی۔ مخالفت کی آوازیں بھی بلند ہوئیں بعض لوگوں نے چاہا کہ ریزولیشن میں جہاں لکھا ہے کہ مجلسِ عاملہ کا انتخاب "مہاتما جی کی **مرضی کے مطابق**" کرنا ہو گا۔ اس کی جگہ یہ لکھدیا جائے کہ "مہاتما جی کے مشورہ کے ساتھ" کرنا چاہیئے۔ لیکن دیوتا کے بھگتوں نے اپنی شردھا کا پورا پورا ثبوت دیا۔ اور اصل ریزولیشن کثرتِ آرا سے منظور ہو گیا۔ مسٹر بوس پہلے ہی بیمار تھے۔ اب ان کی حالت زیادہ نازک ہو گئی۔ کھلے اجلاس میں بڑی کھلبلی مچی۔ ہنگامے برپا ہوئے۔ بغاوت کے آثار ابھر کر سطح پر آ گئے۔ لیکن چونکہ یہ پہلا موقعہ تھا اس لئے مخالفین کی آواز دبا دی گئی اور ریزولیشن منظور کرا لیا گیا۔ مسٹر بوس کی حالت تشویشناک ہو رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ مہاتما جی کی آواز ان کے کانوں میں برابر گونج رہی تھی کہ

دیکھا دیوتاؤں سے بغاوت کرنے کا انجام؟

ہندی اصنامیات میں بہت سے دیوی دیوتا ایسے ہیں جن پر انسانوں کو بھینٹ چڑھایا جاتا ہے اور وہ انہی کے خون سے خوش ہوتے ہیں!

---

ہمیں نہ تو کانگریس کے مزعومہ اصولِ جمہوریت سے کچھ تعلق ہے اور نہ مسٹر بوس اور مہاتما گاندھی کی اس چپقلش سے کچھ واسطہ۔ ہندو قوم انسان پرست واقع ہوئی ہے۔ اس سے اس قسم کی حرکات کا سرزد ہونا کچھ مستبعد نہیں۔ لیکن ہم اپنے قومیت پرست مسلمان بھائیوں سے بالعموم اور ان میں سے طبقۂ علمائے کرام سے بالخصوص ایک بات کا جواب پوچھنے کی جرأت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے ہیں کہ کانگریس ایک جمہوری ادارہ ہے۔ اس میں ہندو اور مسلمان کا کوئی سوال نہیں۔ اس میں کسی کی قیادت اور امامت کو کچھ واسطہ نہیں۔ کانگریس کا صدر جمہور کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اور کانگریس کی پالیسی اسی صدر اور اس کی مجلسِ مشاورت کی وضع کردہ پالیسی ہوتی ہے۔ لیکن تری پوری کانگریس میں جو ریزولیوشن پاس ہوا ہے۔ کیا اس کے بعد ان دعاوی کی کوئی حقیقت باقی رہ جاتی ہے؟ کیا اب بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ کانگریس ایک جمہوری ادارہ ہے؟ کیا اب بھی یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کانگریس کی شرکت کسی غیر مسلم کی اطاعت کے مرادف نہیں!! کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مہاتما گاندھی آپ کے قائد و امام نہیں! کیا یہی وہ آزادی ہے جس کی طرف یوں بڑھ بڑھ کر دعوت دی جاتی ہے۔ ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب ✤ تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اس ریزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے پنڈت پنت نے جو تقریر فرمائی اس کا ایک ایک لفظ بتا رہا تھا کہ ہندو قوم مہاتما گاندھی کو مطلق العنان آمر (Dictator) مانتی ہے۔ اور تمام اختیارات انہی کے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے۔ انہوں نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ جس طرح جرمنی میں ہٹلر کی۔ اٹلی میں مسولینی کی اور روس میں لینن کی ڈکٹیٹر شپ نے قوم کی امامت کی ہے اسی طرح ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی خود مختار قیادت ہمیں کامیابی کی طرف لے جائیگی" (اسٹیٹسمین مورخہ

۱۳ ۳/۳۹) - ہمارے علمائے عظام یہ سب کچھ سُن رہے تھے - اور ہماری گردن فرطِ ندامت سے جُھک جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ آزادی کے وہ تمام بیباک جذبات جو مسلمانوں کے خلاف ٹھاٹھیں مارنے والے سمندر کی طرح موجزن رہا کرتے ہیں بالکل ساکت وصامت تھے - ذرا اس نظارہ کو سامنے لائیے کہ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کرسی صدارت پر متمکن ہیں - مولانا حسین احمد صاحب معہ علما کی جماعت کے اردگرد اسٹیج پر بیٹھے ہیں اور پنڈت پنتھ اپنی تقریر میں فرما رہے ہیں - کہ

"آج ہمارے ملک میں مہاتما گاندھی کی ذاتِ گرامی ایسی ہے جو تمام نقائص سے مبّرا - اور تمام خطاؤں سے منزّہ ہے - (نعرۂ تحسین)" - (اسٹیٹسمین ۱۳ ۳/۳۹)

سارے مجمع میں سے ایک آواز بھی تو ان الفاظ کے خلاف نہیں اُٹھی - ہم باادب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ حضرات کی یہ خاموشی - جو ہر لحاظ سے ان الفاظ کی تائید کے مرادف تھی - ازروئے شریعت کس طرح جائز قرار دی جاسکتی ہے؟ اور پھر یہ بھی کہ جس کانگریس کی اب یہ روش ہو اس میں ایک مسلمان کس طرح سے شریک ہو سکتا ہے؟ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ آپ حضرات اپنے مسلک پر غور کریں -

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ - (۵۷/۱۶)

کیا ایمان والوں کے لئے اب بھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد سے جھک جائیں -

ہم اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے ہیں کہ ان حضرات کو وہ دعوت یاد دلائیں جو قرآن کریم نے اہل کتاب کو ان الفاظ میں دی تھی کہ -

| | |
|---|---|
| تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ | آؤ اس اصول کیطرف جو تمہارے اور ہمارے درمیان مشترک ہے - |
| اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ - | یہ کہ اللہ کے سوا کسی اور کی غلامی اختیار نہ کریں |
| وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْئًا - | اور اس کی اس شانِ یکتائی میں کسی کو شریک نہ کریں - |
| وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ | اور اللہ سے ورے ہی انسانوں میں سے ایکدوسرے کو خدا نہ بنالیں - |

از غلامی فطرتِ آزاد را رُسوا مکن ❖ تاتراشی خواجۂ - از برہمن کافر تری
(اقبال)

---

# حقائق و عبر

## (۱) قوم اور فرقہ

مسٹر آئینگر مرکزی اسمبلی کے ممبر اور کانگریس کے مشہور لیڈر ہیں۔ خود آریہ سماجی نہیں لیکن گذشتہ دسمبر آل انڈیا آرڈین کانگریس کے اجلاس منعقدہ شولاپور کی صدارت کے فرائض آپ ہی نے سرانجام دیئے۔ حیدرآباد کے خلاف ہندوؤں کی طرف سے جو تحریک آندھی کی طرح اٹھی ہے وہ زیادہ تر آپ ہی کی خطبۂ صدارت کی رہینِ کرم ہے۔ اس خطبہ کے دوران میں آپ فرماتے ہیں :-

"آریہ سماج نے ہندو قوم کی جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ ایسی مشہور و معروف ہیں کہ اس خطبہ میں ان کا ذکر کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔" ص۲

یعنی ہندو ایک قوم ہیں۔ اب مسلمانوں کے متعلق سُنئے۔ فرماتے ہیں :-

"مسلمانوں کی طرف سے اب یہ شور مچایا جا رہا ہے کہ وہ صرف اسلام کے پیرو اور ہندوستان کے شہری ہی نہیں بلکہ ایک قوم ہیں۔" ص۳۲

اس کے بعد مسلمانوں کے اس "دعوائے بیجا" کا مضحکہ اڑایا گیا ہے یعنی ہندو ایک مستقل بالذات قوم ہیں اور مسلمانوں کا اس قسم کا دعویٰ محض لغویت پر مبنی ہے! اس "حقیقت" کو سامنے رکھئے اور پھر خود ہی فیصلہ فرمایئے کہ ہر وہ شئے جسے آج قومی (NATIONAL) کہا جاتا ہے۔ کہنے والوں کا اس سے اصلی مطلب کیا ہوتا ہے۔

اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اُس بُت سے خدا سمجھے !!

---

## (۲) ہندو کی تعریف

جب یہ دعویٰ سامنے آگیا کہ ہندو ایک قوم ہیں اور ہندوستان میں اُن کے علاوہ کوئی دوسری قوم آباد نہیں

تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندو کی تعریف کیا ہے۔ یعنی ہندو کہتے کسے ہیں؟ آجتک یہ عقدہ لاینحل رہا ہے۔ کوئی شخص خواہ وہ مغربی محقق ہو یا مشرقی ودوان۔ ہندو کی کوئی جامع اور مانع تعریف پیش نہیں کرسکا۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو کے تعجب انگیز استفسارات پر بھی انھیں کوئی نہیں بتا سکا کہ ہندو کسے کہتے ہیں۔ لیکن جائے استاد خالیست۔ ہندو قوم میں بالآخر ایک ایسا "خاقانی" پیدا ہو ہی گیا جس نے بہزار مشقت اس لفظ کو شرمندۂ معنی کر دیا۔ کلکتہ کے ایک گوردوارہ میں ہندوؤں اور سکھوں کے مشترکہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر ساورکر، صدر ہندو مہا سبھا نے فرمایا:-

"لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وہ شئ جو ہندوستان کی ہو۔ مثلاً کلچر۔ نسل اور روایات وغیرہ اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو۔ جس کے آباد واجداد یہاں کے باشندے تھے اور اس ملک سے محبت رکھتے تھے اور جس کے مذہبی راہ نما اس ملک کے رہنے والے تھے۔" (اسٹیٹسمین ۲۰/۲/۳۹)

آئندہ مردم شماری ہندو کی اس تعریف کے ماتحت ہونے دیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کتنی باقی رہتی ہے۔

---

## (۳) آزاد ہندوستان کا مذہب

سب سے بڑی چیز جو مسلمانوں کو ہندو اکثریت میں جذب نہیں ہونے دیتی وہ ان کا مذہب ہے۔ اور ہندوؤں نے اسے اچھی طرح سے محسوس کرلیا ہے کہ جب تک اس روڑے کو راستے سے ہٹایا نہیں جائیگا "متحدہ قومیت" کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کی خاطر جو "مقدس اور معصوم تدابیر بروئے کار لائی جارہی ہیں طلوعِ اسلام کے صفحات پر ان کا متعدد بار تذکرہ آچکا ہے۔ ہندوؤں میں چونکہ تنظیم پیدا ہوچکی ہے اسلئے ان کی تمام تدابیر نہایت منظم طریق پر عمل میں لائی جاتی ہیں۔ مذہب کے معاملہ میں مہاتما گاندھی کے حجلۂ دماغ نے ایک

تعلیمی اسکیم کا خاکہ تیار کیا۔ جسمیں انھوں نے اپنے مخصوص مہاتمانہ انداز میں اس اصول کو پیش کیا کہ بچے کے دل سے اس عقیدہ کو نکال دینا چاہیئے کہ اس کے مذہب کو دیگر مذاہب پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔ بنیادی خیال کی اس گیند کو انھوں نے میدانِ سیاست میں چھوڑ دیا۔ اسکے بعد مختلف علوم وفنون کے مشاق کھلاڑی آگے بڑھے اور اس گیند کو منزلِ مقصود تک لیجانے میں مصروف ہوگئے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس خیال کو پیدا کئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ملک میں چاروں طرف سے یہ آوازیں آرہی ہیں کہ آنے والی نسلوں کو فی الواقع یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اصولی سچائیوں کے اعتبار سے تمام مذاہب یکساں ہیں اور فرعی اختلافات کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ کہیں اکبر کے دینِ الٰہی کی تجدید کا سوال پیدا کیا جارہا ہے اور کہیں داراشکوہ کے کارہائے نمایاں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں بنارس کے ڈاکٹر بھگوان داس صاحب کا ایک تفصیلی مضمون "ہندوستان ٹائمز" بابت ۲۲ فروری ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا ہے جسمیں انھوں نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی منافرت کے اسباب کیا ہیں اور اُن کے مناقشات مٹانے کی تجویز کیا ہوسکتی ہے۔ فرماتے ہیں :-

"ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی غلط فہمی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ عام لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ یہ ہر دو مذہب (بلکہ تمام بڑے بڑے مذاہب) اپنی اصولی باتوں (ESSENTIALS)[1] میں بالکل یکساں ہیں۔ اور اختلافات جزئی باتوں میں ہیں۔ جنھیں مولانا ابوالکلام آزاد فروع سے تعبیر کرتے ہیں[2]۔ ..... اس مرض کا حتمی علاج یہ ہے کہ ان اصولوں کی تعلیم عام کردی جائے جو تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں (اور اس کی عملی ترکیب یہ ہے کہ) کانگرسی وزارت کو چاہیئے کہ ایک مختصر سی کمیٹی مقرر کرے جو اس قسم کی

---

[1] وہی الفاظ جو ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کی وارد ھا اسکیم کی رپورٹ میں درج ہیں۔

[2] ملاحظہ ہو مضمون "وارد ھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان" مطبوعہ طلوع اسلام بابت اگست ۱۹۳۸ء

نصاب کی کتابیں تیار کرے جن میں مشترکہ اصولوں کی تعلیم موجود ہو .....
.....اسکے ساتھ ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمام بچوں کے ذہن نشین کرا دیا
جائے کہ ہندوستان کے تمام موجودہ مسلمان اپنے ہندو آباء و اجداد کی اولاد
ہیں۔ اِس لئے ہندو اور مسلمان دور یا نزدیک سے باہمی رشتہ دار ہیں۔
.....میری مخلصانہ درخواست ہے کہ اِن تمام کتابوں (کے مجموعہ)
سے جنھیں عوام الناس مقدس صحائف مانتے ہیں ایک جدید مجموعہ تیار
کیا جائے ..... میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اِس "عالمگیر مذہب"
کی مشترکہ کتاب کی تجویز میں نے اِس سے پیشتر کئی ایک مواقع پر پیش
کی ہے۔"

یہ اقتباس کسی تبصرہ کا محتاج نہیں۔ تمام ہندوستان کے لئے ایک "عالمگیر مذہب" اور اس مذہب کی ایک "مشترکہ کتابِ مقدس" یہ ہے آزاد ہندوستان میں آنے والے مذہب کا تصور

---

یہ تو ہیں ہندوؤں کے قدامت پرست طبقہ کے خیالات لیکن اِس باب میں اُن کے قدیم و جدید، کبیر و صغیر میں کوئی فرق نہیں۔ الکفر ملۃ واحدۃ۔ پنڈت جواہر لال نہرو ہمیشہ اپنی لامذہبیت اور دھریت کا اعلان بڑے فخر سے کرتے رہتے ہیں۔ اور ہر مقام پر ظاہر کرتے ہیں کہ انھیں مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن جہاں مسلمانوں کے مذہب کا سوال سامنے آتا ہے انھیں بھی ایسی ہی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جیسی مہاتما گاندھی یا ڈاکٹر بھگوان داس جیسے قدامت پرست حضرات کو۔ پچھلے دنوں کلکتہ میں برہمو سماج کے مشہور راہ نما شری کیشب چندر سین کی صد سالہ برسی کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے پنڈت جی نے بتایا کہ اسلام کس طرح ہندوستان میں آیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان شروع سے اپنی مذہبی رواداری کے لئے مشہور رہا ہے۔ مختلف کلچر اور تصورات کی جس قدر امواج باہر سے آتی رہیں

ہندوستان اُن کو اپنے اندر جذب کرتا رہا۔ لیکن اسلام کی آمد سے یہاں تصادم کی روح پیدا ہوگئی۔ اِس تصادم کو مٹانے کے لئے جو کوششیں کی گئیں اُن کے متعلق فرمایا :۔

"ہندوستان میں اِسلام ایک غلط طریق پہ آیا۔ بایں ہمہ اِن ہر دو متضاد تصوراتِ زندگی (اسلام اور ہندومت) میں امتزاج پیدا کرنے کے لئے ایک کو دوسرے میں جذب کرنے کا عمل شروع ہوگیا۔ یہ سلسلہ گرو نانک اور بھگت کبیر جیسی شخصیتوں اور اکبر جیسے بادشاہ کی کوششوں سے کافی ترقی کرگیا۔ اکبر نے اس باہمی امتزاج کے لئے خاص طور پہ کوشش کی۔ ہر چند وہ اِس باب میں اپنی توقعات کے مطابق کامیاب نہ ہوسکا۔ لیکن اس سلسلہ میں تقدّم کا سہرا اس کے سر ہے۔ اُس کے بعد یہ کوششیں ماند پڑ گئیں لیکن یہ یہ سلسلہ بالکل منقطع نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ آگے ضرور بڑھتا رہا۔ لیکن قبل اِس کے کہ یہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا، ایک بیرونی طاقت ہندوستان میں آپہنچی۔" (لائٹ مورخہ $16\frac{2}{39}$)

یعنی وہ رَو جسے اکبر نے چلایا تھا۔ اور داراشکوہ نے جسمیں مزید تموّج پیدا کیا تھا آہستہ آہستہ آتش خاموش کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔ اور قریب تھا کہ اسلام، برہمو سماج کی شکل اختیار کر جائے لیکن انگریزوں کی آمد سے یہ سلسلہ رُک گیا۔ اب چونکہ انگریز کی قوّت کم ہو رہی ہے اسلئے اِس سلسلہ کو پھر وہیں سے شروع کر دینا چاہیئے جہاں سے اس کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ داردھا کی تعلیمی اسکیم اس کوشش کی عملی شکل ہے۔ اور "متحدہ قومیت" کا تصوّر اس کا سنگ بنیاد۔ وہ متحدہ قومیت جس کے متعلق ابھی اگلے دنوں مسٹر ستیا مورتی نے مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں بڑی عمدہ تصریح فرمائی۔ اسمبلی میں ایک سوال اُٹھا کہ محکمۂ ریلوے کی ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ مسٹر ستیاورتی نے بتایا کہ کانگریس پارٹی ایسے معاملات میں کیوں غیر جانبدار رہنا چاہتی ہے۔ فرمایا کہ :۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہ ایوان اپنے اندر قومیت کا جذبہ پیدا کرے جس سے مفہوم یہ ہے کہ وہ اوّل و آخر ہندوستانی ہوں۔ اور یہ اُسوقت ہوسکیگا جب ہندو آہستہ آہستہ اِس بات کو بھول جائیں کہ وہ ہندو ہیں۔ اور مسلمان بھول جائیں کہ وہ مسلمان ہیں۔" (ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۳ ۲/۳۹)

یہ بھی واضح رہے کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کی قلتِ نیابت کے مسئلہ پر غیر جانبدار رہنے والی کانگریس پارٹی وہی ہے جس نے "آرمی بل" کے زمانہ میں کہرام مچا رکھا تھا کہ اندھیر ہے کہ فوج میں مسلمان چھیاسٹھ فیصدی ہیں۔ حکومت فوجی ملازمتوں کو آبادی کے تناسب کے لحاظ سے مختلف اقوام میں کیوں تقسیم نہیں کرتی!

---

## لامذہب کی مذہبیت

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اُسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہوگیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اُسے کیسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔"

(میری کہانی۔ از پنڈت جواہر لال نہرو ص۱۶۱)

مذہب کے متعلق آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات ملاحظہ فرمالئے۔ لیکن یہ اس مذہب کے متعلق ہیں جسے منظم مذہب کہتے ہیں یعنی ایسا مذہب جو محض ایک پرائیویٹ عقیدہ نہ ہو بلکہ اجتماعیت کی زندگی سکھاتا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ دُنیا میں ایسا مذہب اسلام کے سوا اور کوئی نہیں۔ اب اِنہی لامذہب پنڈت جی کی زبان سے ہندو مذہب کی آزادی کے متعلق بھی کچھ سنئے۔ ریاستی کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان میں مدنی آزادی (Civil Liberty) کی سب سے پست سطح

حیدرآباد میں ملیگی۔ اور پچھلے دنوں اِس چیز کی طرف بھی توجّہ منعطف کرائی گئی ہے کہ وہاں بعض مذہبی رسوم کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ حیدرآباد میں آزادی کی یہ پست سطح کسی متشدّد تحریک کا ردِّ عمل نہیں بلکہ ایک عرصہ سے وہاں حالات ہی ایسے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز $\frac{۲}{۳۹}$ ۱۶)

یعنی وہی پنڈت جی جو مذہب کو یکسر مٹا دینے کی آرزو رکھتے ہیں جب آریہ سماج کی مدافعت اور حیدرآباد کی مسلمان حکومت کی مخالفت میں اُٹھتے ہیں تو اس حکومت کیخلاف سب سے بڑا الزام یہ عائد کرتے ہیں کہ وہاں مذہبی رسوم پر پابندیاں کیوں عائد کر دی گئی ہیں۔ یہ ہے ہندو قوم کے آزاد خیال حضرات کی بے تعصبی کی مثال!

اب ذرا یہ بھی دیکھتے جایئے کہ وہ کون سی "مذہبی آزادی" ہے جس پر پابندیاں عاید ہونے کی وجہ سے پنڈت جی کے دھارمک ہردے (مذہب پرست دل) میں یوں ٹیس پیدا ہوئی ہے۔ آریہ سماجی حضرات کی تقریروں اور تحریروں کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ یہ اقتباسات اور اِن جیسے متعدد اور۔ اِس پمفلٹ میں درج ہیں جو حکومتِ نظام نے "حیدرآباد میں آریہ سماج" کے عنوان سے شائع کیا ہے :-

"ریاست نظام کو ہندوستان میں باقی نہیں رہنا چاہیئے۔ ہندوستان میں ہندو راج ہونا چاہیئے۔ یہاں کوئی مسلمان بادشاہ نہیں رہ سکتا۔ ہمیں نظام کا تخت چھ مہینے کے اندر حاصل کرلینا ہے۔"

"پیغمبر اسلام کے والد ایک ہندو قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔" (نعوذ باللہ)

"آریوں کو چاہیئے کہ ہندوستان میں ایک مسلمان بھی باقی نہ رکھیں۔"

بعض آریہ سماجی کتابوں کے شبھ نام ملاحظہ ہوں :-

اسلامی گپیں — شیطان اور اللہ میاں کی جھڑپ — کہاں قرآن اور کہاں الیشوری گیان!

ایک بھجن کے شلوک سنئے :-

"ہم محمد کے پیروؤں کو لات مار کر ختم کر دینگے"

" بہادر آریہ گاؤں میں گھومتے پھرتے ہیں "

" تو مسلمان غور گلی کوچوں میں چھپ جاتے ہیں "

(استغفر اللہ)

یہ ہے نمونہ اس مذہبی آزادی کا جس پر پابندیاں عاید ہونے پر پنڈت جی اعلانِ جنگ فرما رہے ہیں۔

اور یہ ہیں وہ پنڈت جی جن کی شان میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی فرماتے ہیں کہ وہ باوجود ہندو ہونے کے مسلمانوں کا تحفظ چاہتے ہیں۔

---

## دیوناگری رسم الخط

"رسم الخط اور ادب کا بہت بڑا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں۔ آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم و جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مُردہ ہو چکی ہو۔" (پنڈت جواہر لال نہرو - میری کہانی جلد اوّل ص۲۹۵)

رسم الخط کی اہمیت آپ پر واضح ہو گئی۔ اب انہی حضرات کے منصوبے ملاحظہ فرمائیے۔ مہاتما گاندھی لکھتے ہیں :-

"میں نے پہلے ہی اپنا خیال ظاہر کر دیا ہے کہ صرف دیوناگری ہی ایسا رسم الخط ہے

جو ہندوستان میں عالمگیر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔" (ہریجن ۹ے۴ ۱)

کانگریس صوبوں میں جس تیزی سے اس رسم الخط کی ترویج ہو رہی ہے وہ بھی کسی دیکھنے والی آنکھ سے پوشیدہ نہیں۔ بیس برس کے بعد دیکھئیگا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے

---

## اُن کی نگاہ میں

سندھ کے وزیر اعظم خان بہادر اللہ بخش صاحب کے متعلق ہم نے لکھا تھا کہ وہ لیلائے وزارت کے تحفظ کے لیے کس قدر صحرانوردیاں اور دشت پیمائیاں کرتے پھر رہے ہیں۔ اس تنقید کو ممکن ہے بعض حلقوں میں اختلاف مسلک پر محمول کر لیا جاتا۔ لیکن سندھ اسمبلی کے بھرے اجلاس میں ایک کانگریسی ممبر نے خود "اپنے" وزیر اعظم کی شان میں جو کچھ فرمایا وہ ہر باحمیت انسان کی آنکھ کھولنے کے لئے کافی ہے۔ اس نے کہا:۔

"خان بہادر صاحب ہر قسم کی ممکن اور ناممکن کوشش اس باب میں صرف کر رہے ہیں کہ کہیں وزارت کی گدی ان سے نہ چھن جائے۔" (اسٹیٹمین ۹ے۳ ۲۲)

لو! وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے

یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

سچ فرمایا ہے حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہ ؎

ہر کہ از بندِ خودی وارست۔ مُرد      ہر کہ با بیگانگاں پیوست۔ مُرد

---

## کانگریس اور مسلمان

آدمی ہزار چھپائے۔ بعض اوقات بلا ارادہ ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جن سے حقیقت خود بخود جھلک پڑتی ہے۔ مسٹر رشبرک ولیمز کے بعض اعتراضات کے جواب میں مہاتما گاندھی نے ۴ر مارچ کے ہریجن میں ایک مضمون لکھا ہے جس کے دوران میں فیڈریشن کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے قلم سے یہ الفاظ نکل گئے۔

"جہانتک میں اپنے قلب کا اور کانگریس کا جائزہ لے سکا ہوں مسلمانوں کی تائید

کے بغیر فیڈریشن کا یہاں خواب بھی کسی کو نہیں آسکتا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ جبتک مسلمان اس کی مخالفت کرتے ہیں کانگریس کو فیڈریشن کے مسئلہ کے متعلق متردد ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

غور طلب ٹکڑہ یہ ہے کہ "جب تک مسلمان فیڈریشن کی مخالفت کرتے رہینگے کانگریس کو اسکے متعلق متردد ہونے کی کوئی ضرورت نہیں"۔ یعنی کانگریس مسلمانوں سے جداگانہ ادارہ کا نام ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو ادارہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اُن سے جداگانہ ہوگا وہ لامحالہ غیر مسلم ادارہ ہوگا۔ چونکہ ہندوؤں کے ذہن میں کانگریس اور ہندو مرادف الفاظ ہیں اسلئے جب غیر شعوری طور پر اُن کے دل سے کوئی بات نکلتی ہے تو وہ اس حقیقت کی غمازی کر دیتی ہے۔ اور اگر مہاتما جی نے دانستہ ایسا کہا ہے تو کیا ہمارے مسلم قومیت پرست حضرات اُن سے دریافت فرمائینگے کہ کانگریس کو مسلمانوں سے الگ ادارہ قرار دے کر انھوں نے اِن حضرات کو کہاں جگہ دی ہے! یہ ہے کانگریس کے مشترکہ جمہوری ادارہ کی بے نقاب حقیقت۔!!

---

## قابلِ رشک سمجھوتہ

حکومت صوبجات متحدہ نے مندرجہ ذیل کمیونک مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۳۹ء کو شائع کیا:

"حکومت پبلک کی توجہ اس قابلِ تعریف طرزِ عمل کی طرف منعطف کرانا چاہتی ہے جو ہندو اور مسلمان باشندگان گورکھپور نے گذشتہ بقرعید کے موقع پر اختیار کیا۔ جس میں انھوں نے ایکدوسرے کے ساتھ تعاون کیا۔ اور حکامِ ضلع کو امن قائم رکھنے میں مدد دی۔"

شہر گورکھپور میں ایک بہت پرانا مندر بنام گورکھناتھ ہے جو اُس شہر اور ضلع کے ہندوؤں کے نزدیک بڑا مقدس سمجھا جاتا ہے۔ مندر کے قریب گذشتہ چند سالوں میں ایک محلہ بنام "زاہد آباد" آباد ہوگیا ہے۔ جس کے باشندے

زیادہ تر مسلمان ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ہندوؤں اور مسلمانوں میں محلہ زاہد آباد کے مسلمانوں کے بقر عید پر گائے کی قربانی کرنے کے متعلق جھگڑا پیدا ہوا۔ معاملہ عدالتِ دیوانی میں پیش ہوا۔ جہاں سے مسلمانوں کے حق میں ڈگری ہوگئی لیکن گذشتہ سال حکامِ ضلع نے نقضِ امن کے اندیشہ سے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر کے گائے کی قربانی کی ممانعت کر دی۔ مسلمانوں میں اس پر بہت ناراضگی پھیلی۔ اور انھوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی۔ جس پر بڑا جوش پھیل گیا۔ اور معاملہ فوجداری عدالتوں تک پہنچا۔"

"اس سال پھر اسی طرح کی صورتِ حال پیدا ہوگئی اور نقضِ امن کا اندیشہ تھا۔ دونوں فرقوں کے سرکردہ آدمیوں نے ایسی فرقہ وارانہ لڑائیوں کے خراب نتائج کا احساس کرتے ہوئے اس جھگڑے کو پیار اور محبت سے مٹانے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب ہوگئے۔ ہندوؤں نے اپنے زاہد آباد کے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں اپیل کی کہ وہ زاہد آباد میں گائے کی قربانی سے احتراز کریں۔ کیونکہ وہ جگہ گورکھناتھ مندر کے نزدیک ہے۔ اور ایسی جگہ گائے کی قربانی ان کے لئے تکلیف دہ ہوگی اور ان کے مذہبی احساسات کو مجروح کرنے کا باعث ہوگی۔ مسلمانوں نے فوراً اس بات کو مان لیا۔ اور دونوں قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کے متعلق ضروری قدم اٹھائے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جا رہا اور انھوں نے از خود اپنے ہندو ہمسایوں کی درخواست کو منظور کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محلہ زاہد آباد میں گائے کی قربانی نہ ہوئی۔ اور اس طرح شہر گورکھپور میں امن قائم ہوگیا۔"

"حکومت اِس دوستانہ سمجھوتے پر خوشی کا اظہار کرتی ہے اور شہر گورکھپور کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو تہِ دل سے مبارکباد دیتی ہے کہ انھوں نے دوستانہ افہام و تفہیم سے اس مسئلہ کا ایک کامیاب حل نکال لیا۔"

(ہندوستان ٹائمز ۳۰-۳۹/۴)

ہم بھی خوش ہیں کہ گورکھپور کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں سمجھوتہ ہوگیا لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس معاملہ میں ہندوؤں نے کتنی عظیم الشان "قربانی" کی ہے۔ اور یوپی کی کانگریسی حکومت نے مسلم اقلیت کے حقوق کا کس قدر احترام کیا ہے۔ عدالتِ دیوانی سے مسلمانوں کو ڈگری مل جاتی ہے اور فیصلہ دیدیا جاتا ہے کہ انھیں قربانی کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن قربانی کے موقع پر نقضِ امن کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نقضِ امن کے موجب ہندو ہی ہو سکتے تھے جو مسلمانوں کو ان کے اس حق سے روکنے کی کوشش کرتے تھے جو حق ان کو از روئے فیصلۂ عدالت حاصل تھا۔ حکومت پر اگر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا تھا کہ وہ مسلم اقلیت کے حقوق کا از خود تحفظ کرے تو اتنا تو ضروری تھا کہ وہ اپنی عدالت کے فیصلہ کے برقرار رکھنے کا ہی انتظام کرتی۔ لیکن یہ انتظام کیسے ہوا؟ دفعہ ۱۴۴ نافذ کی گئی۔ اور مسلمانوں کو قربانی کرنے سے روک دیا گیا۔ یہ ہے کانگریسی حکومت کا عدلِ نوشیروانی!

دوسرے سال ہندو پھر مزاحم ہوئے اور مسلمانوں نے اپنا وہ حق چھوڑ دیا جو عدالت نے انھیں دلایا تھا۔ یوں سمجھوتہ ہوا۔ اور اس سمجھوتہ پر حکومت یوپی مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو مستحقِ تبریک و تہنیت سمجھتی ہے۔ ہندو تو کانگریسی حکومت کے نزدیک واقعی مستحقِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنی ضد منوا کے چھوڑی۔ معلوم نہیں مسلمان کیوں مبارکباد کے مستحق قرار دیئے گئے ہیں!

پھر یہ بھی غنیمت ہے کہ مسلمانوں نے "بغیر کسی دباؤ کے" دوسرے ہی سال اپنا حق

چھوڑ کر سمجھوتہ کر لیا۔ ورنہ اگر وہ ایک آدھ سال اور نہ مانتے تو شاید انھیں بغیر کسی دباؤ کے" اس مقدمہ کا خرچ بھی ہندوؤں کو ادا کرنا پڑتا جسمیں عدالت نے مسلمانوں کو ڈگری دیدی تھی۔

اسی قسم کے سمجھوتے ہیں جن کے متعلق قرآن کریم نے فرمایا ہے :-

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۲/۱۲۰

اور یہود اور نصاریٰ کبھی تم سے راضی نہ ہونگے جبتک تم اُن کے مسلک کی پیروی نہ کرو ؛

ہندو کے نزدیک باہمی سمجھوتہ کی صرف ایک صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان انکی ہر ایک شرط کو بلا چون وچرا مان لے۔

## حکومتِ پنجاب کے مفتی اعظم

ہمارے ہاں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بڑے منصب پر فائز ہو جائے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ اب وہ ہر معاملہ میں سند (authority) کا حکم رکھتا ہے۔ پنجاب میں میاں عبدالحی صاحب وزیر تعلیم ہیں۔ پچھلے دنوں امرتسر میں کھیل اور ورزش کی کوئی نمائش تھی، اسمیں تقریر کرنے کے لئے اُٹھے تو فرمایا کہ :-

"مذہب انسانوں کا پرائیوٹ معاملہ ہے۔ ہم تمام ہندوستانی ہیں اور اس ملک کے باشندے ہونے کی جہت سے ایکدوسرے کے بھائی۔" (اسٹیٹسمن ۲۷/۲/۳۹)

ہم میاں صاحب سے درخواست کرینگے کہ اگر اُن کے پاس اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ اسلام مسلمانوں کے تمام معاملاتِ زندگی کو محیط نہیں بلکہ ایک پرائیوٹ معاملہ ہے" کوئی دلیل ہے تو وہ اُسے پیش کریں۔ طلوعِ اسلام کے صفحات اس کے لئے کھلے ہیں۔ ورنہ انھیں مخلصانہ مشورہ دینگے کہ جس بات کے متعلق علم نہ ہو اس پر رائے زنی کرنا نقصان سے خالی نہیں ہوتا۔

کہ ؎ تا مرد سخن نگفتہ باشد ـــــ عیب و ہنرش نہفتہ باشد

ہم ان حضرات کو کسطرح سمجھائیں کہ ایک مسلمان مذہب کا صحیح پیرو ہوتے ہوئے نوعِ انسانی کا سچا غمخوار ہو سکتا ہے اور اُسے دیگر انسانوں کے ساتھ معاملات کرنیمیں اپنے مذہب کو طاقِ مسجد میں اُٹھا کر رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

# تقریظات

**صلوٰۃ و سلام** - از مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند۔

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں نبی اکرمؐ پر درود شریف پڑھنے کے فضائل بیان کیے گئے ہیں مثلاً

(۱) "سیدنا موسےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی آئی۔ اے موسےٰ کیا تم چاہتے ہو کہ قیامت کے دن تم کو پیاس کی تکلیف نہ ہو حضرت موسیٰ نے عرض کی ہاں میری خواہش یہ ہے کہ قیامت کے دن مجھ کو پیاس نہ لگے، حضرت حق نے ارشاد فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کثرت سے پڑھا کرو"۔ ص۶

(۲) "ایک بندہ قیامت میں اپنی خطاؤں کے باعث دوزخ کے فرشتوں کی نگرانی میں دیدیا جائیگا ........ نبی کریم اسکے پاس تشریف لائیں گے اور تمام حالات دریافت کریں گے اور جب اس بندے کا نام اور نسب وغیرہ معلوم کرینگے تو فرشتوں سے فرمائیں گے کہ ایک دفعہ اسکے اعمال کا پھر وزن کرو، چنانچہ فرشتے دوبارہ وزن کرینگے۔ نبی کریمؐ ایک نورانی صحیفہ اُسکی نیکیوں کے پلڑے میں رکھ دینگے جس سے اُس شخص کی نیکیاں گناہوں سے بڑھ جائیں گی۔ اور اس شخص کو جنت میں جانیکا حکم ہو جائیگا یہ شخص جنت کی بشارت سُنکر، نبی کریمؐ سے عرض کریگا یا رسول اللہؐ یہ کاغذ کیسا تھا جس کی وجہ سے میری نیکیاں بھاری ہوگئیں۔ اور مجھ کو جنت کا حکم ہوگیا۔ نبی کریمؐ فرمائیں گے تو نے دنیا میں مجھ پر درود بھیجا تھا۔ اس کاغذ میں وہ درود لکھا ہوا تھا جو شخص مجھ پر درود پڑھتا تھا، فرشتے اسکا نام اور پورا پتہ میرے رجسٹر میں درج کرا دیتے تھے"۔ ص۹-۸

(۳) "جو شخص مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ کراماً کاتبین کو حکم دیتا ہے کہ تین دن تک اس بندے کا کوئی گناہ نہ لکھو"۔ ص۱۱

(۴) آپؐ نے فرمایا جو شخص مجھ پر جمعہ کے دن سو دفعہ درود پڑھے گا اسکے اسی برس کے گناہ مٹا دیئے جائیں گے"۔ ص۱۴

(۵) حضرت شبلی علیہ الرحمۃ کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک عورت کی بیٹی انتقال کر گئی اس عورت نے اُسے خواب میں دیکھا کہ سخت عذاب میں مبتلا ہے، اسکے ایک عرصہ بعد حضرت شبلی نے اُسے خواب میں دیکھا تو وہ جنت میں ایک تخت پر بیٹھی تھی، انہوں نے اُس سے اسکی نجات کا سبب دریافت کیا تو لڑکی نے کہا کہ "ایک شخص نے قبرستان سے گزرتے ہوئے ایک بار درود کا ثواب مردوں کو بخشا، جناب باری کا ارشاد ہوا ارفعوا العذاب عنھم ببرکۃ ثواب صلواۃ ھذا الرجل (اُس شخص کے درود کے ثواب کی برکت کی وجہ سے ان تمام سے عذاب اُٹھالو) اے شبلی! اِس گورستان میں پانچسو مردے عذاب میں مبتلا تھے۔ سب سے عذاب اُٹھالیا گیا۔ میں بھی انہی میں شریک ہوں" ص۴۳

(۶) "جب کوئی شخص لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ اور اسکے بعد اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ بھی کہتا ہے تو یہ دونوں کلمے اُسکے مُنہ سے سبز پرندے کی شکل میں نکلتے ہیں، یہ سبز پرندہ عرش کے قریب جاکر پھڑپھڑاتا ہے، حضرت حق کا ارشاد ہوتا ہے، اے میرے اور میرے نبیؐ کے تعریف کے مجموعے ٹھہر جا۔ یہ پرندہ عرض کرتا ہے الٰہی کیونکر قرار حاصل کروں۔ ابھی تک ان کلموں کے پڑھنے والے کی مغفرت اور بخشش کا اعلان تو ہوا ہی نہیں۔ دوبارہ اس پرندے کو پھر سکون کا حکم ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہی عرض کرتا ہے۔ تیسری مرتبہ ارشاد ہوتا ہے ٹھہر جا میں نے اِس بندے کو بخش دیا اور اسکی خطائیں معاف کردیں" ص۱۱

(۷) "جب حضرت حوّا پیدا ہوئیں اور حضرت آدمؑ نے ان کی جانب رغبت ظاہر کی تو ارشاد ہوا اے آدم اسکا مہر ادا کرو۔ عرض کی الٰہ العالمین مہر کی تعداد اور جنس کیا ہے حکم ہوا جنکا نام تم نے جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا تھا اپنر سو بار درود بھیجو۔ بعض روایتوں میں بیس۲۰ بار۔ اور بعض میں تین بار بھی آیا ہے" ص۴۸

اِس قسم کی بہت سی، روایات درج کتاب ہیں۔ جناب مصنف کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں یہ پمفلٹ ۶۴ صفحات پر عمدہ کاغذ پر چھپا ہے۔ کتابت، طباعت اور ٹائیٹل دیدہ زیب ہے

مینجر دینی بک ڈپو۔ کوچہ ناہر خاں، دہلی سے پانچ آنہ میں ملسکتا ہے ۔

**رُباعیات اخگر**۔ تقطیع چھوٹی۔ حجم ۸۰ صفحے۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ کاغذ خاصا۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے آٹھ آنہ میں مل سکتی ہے۔

جناب امداد حسین صاحب اخگر مرادآبادی کی تقریباً ڈیڑھ سو رُباعیات کا مجموعہ ہے۔ شروع میں جناب اخگر کی عکسی تصویر اور حالات درج ہیں اور اسکے بعد مختصر سے مقدمہ میں آپ کی شاعری سے تعارف ہے۔ رُباعیات اخگر اس عشقیہ شاعری کے خلاف احتجاج ہے جو آمد سے سراسر محروم اور آورد کی یکسر شرمندۂ احسان ہوتی ہے، جناب اخگر شعر سے اِن جذبات عالیہ واحساساتِ لطیفہ کو بیدار کرنا چاہتے ہیں جو ہم میں مخفی ہیں اور جنہیں معرض شہود پر لانے سے افراد کی زندگیاں بنتی ہیں اور قوم کو امتیاز نصیب ہوتا ہے، جناب اخگر کی یہ کوشش قابل مبارک باد اور ان کی رُباعیات قدردانی کی یقیناً مستحق ہیں۔

ہم ڈاکٹر عبدالحق صاحب بی اے سکریٹری انجمن ترقی اُردو کی اِس رائے سے متفق ہیں کہ جناب اخگر نے خوب خوب مضمون پیدا کیئے ہیں اور ان کو شستہ زبان میں خاص انداز سے ادا کیا ہے جنابِ اخگر کی تین چار رُباعیاں طلوعِ اسلام میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اسلیئے قارئین انکے اندازِ سخن سے خود بھی واقف ہیں۔

---

# یومِ اقبالؒ

فروری کے پرچہ میں اعلان کیا گیا تھا کہ مسلم برادرہڈ کی طرف سے ۲۱ فروری ۱۹۳۹ء کو یومِ اقبالؒ منایا جائیگا۔ اب اطلاع موصول ہوئی ہے کہ اِس عظیم المرتبت اجتماع کا انعقاد ۹/۱ اپریل کو ہوگا۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ یہ زندگی بخش تقریب ہندوستان کے گوشے گوشے میں قابلِ رشک طریق پر منائی جائیگی۔

# مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

تالیف جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ایڈیٹر "ترجمان القرآن"

یہ بے نظیر کتاب دو رسالوں کی صورت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ۔ موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک نہایت ہی جامع۔ پُرخیال اور سبق آموز تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے گذشتہ انقلابات نے مسلمانوں پر کیا کیا اثرات چھوڑے اور اب جو انقلاب آرہا ہے وہ مسلمانوں کو کہاں پہنچا جائیگا؟ اسوقت ہم کو کیا کرنا چاہیئے اور کیا ہرگز نہ کرنا چاہیئے؟ یہ اور دیگر متعلقہ سوالات ایسی حکیمانہ صحتِ نظر کے ساتھ واضح کئے گئے ہیں۔ کہ ایک دفعہ بغور پڑھ لینے کے بعد ہندوستان کی اسلامی سیاست آئینہ بن کر سامنے آجاتی ہے۔ اور ہمارے قومی مسئلہ کا کوئی پہلو بھی غیر واضح نہیں رہتا۔ فاضل مؤلف کا نہیں بلکہ پڑھنے والوں کا دعویٰ ہے۔ کہ اس بلند پایہ اور ٹھوس حقائق سے مملو کتاب کا خود پڑھنا اور دوسرے مسلمانوں تک پہنچانا بجائے خود ایک جہاد ہوگا۔ اور بہت بڑے ثواب کا موجب۔ یہ کتاب کسی تجارتی غرض سے شائع نہیں کی گئی۔ بلکہ مسلمانوں کی سیاسی تعلیم مقصود ہے۔

قیمت حصہ اوّل چار آنے (۱۳۵ صفحات) قیمت حصہ دوم۔ آٹھ آنے (۲۳۵ صفحات)

ملنے کا پتہ:۔ دفتر "ترجمان القرآن" ملتان روڈ۔ لاہور

# طلوعِ اسلام

یعنی

ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کا ماہوار مجلّہ۔ جو اسلام کے جماعتی نصب العین کے مطابق مئی ۱۹۳۸ء سے شائع ہو رہا ہے۔

## طلوعِ اسلام

کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ تمام اُمتِ اسلامیہ کا مشترکہ پرچہ ہے اس کا

## نصب العین

مسلمانوں میں جماعتی زندگی کا احیا قرآن کریم کے حقائق و علوم کی اشاعت، سیاسیاتِ حاضرہ میں مسلمانوں کی صحیح اور سچی رہنمائی ہے۔

## جو لوگ !

مغربی علوم و فنون سے مرعوب ہو چکے ہیں اُن کو یہ رسالہ بتائے گا کہ دُنیا خواہ کتنی ہی آگے نکل جائے قرآن کریم ہر زمانہ میں اُس سے آگے ہی نظر آئے گا۔

## بلند پایہ مضامین !

کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اکثر مضامین کتابی شکل میں کئی کئی بار طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ وہ سیاسیات حاضرہ میں مسلمانوں کا سچا رہنما، بہترین مشیر اور ان پر غور و فکر کی راہیں کشادہ کرنیوالا ہے۔

قیمت سالانہ پانچ روپیہ صہ/

نمونہ مفت طلب فرما کر خریداری کا فیصلہ کیجیے ! (منیجر طلوع اسلام بلیماران دہلی)